۴۲

الشّوریٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور زمانۂ نزول

اس سورہ کا بھی مرکزی مضمون توحید ہی ہے۔ اسی کے تحت قیامت سے بھی ڈرایا گیا ہے اس لیے کہ توحید کی اصلی اہمیت اسی وقت سامنے آتی ہے جب اس بات پر ایمان ہو کہ انصاف کا ایک دن لازماً آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص کو سابقہ اللہ واحد و قہار ہی سے پیش آئے گا، کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کی پکڑ سے کسی کو بچا سکے یا اس کے اذن کے بغیر اس کے سامنے زبان ہلا سکے۔

استدلال کی بنیاد اس میں دعوتِ انبیاء کی تاریخ پر ہے کہ آدمؑ و نوحؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاء نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور ان کو بھی اللہ نے اسی طرح وحی کے ذریعہ سے تعلیم دی جس طرح یہ قرآن وحی کیا جا رہا ہے۔ مختلف حلقوں نے دین کے معاملہ میں جو اختلاف کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے رسولوں نے الگ الگ دینوں کی تعلیم دی بلکہ اس کی وجہ صرف باہمی عداوت و رقابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے باوجود مختلف گروہوں نے اپنی ضد اور اپنی برتری قائم رکھنے کے زعم میں حق سے اختلاف کیا اور اس طرح لوگ مختلف گروہوں اور حلقوں میں بٹتے گئے۔ یہ قرآن اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے ایک میزانِ حق بن کر نازل ہوا ہے۔ اگر لوگ اس میزان کے فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے تو اب قیامت کی میزانِ عدل لوگوں کا فیصلہ کرے گی۔

سورہ کے مطالب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکی دور کے آخر میں، ہجرت سے متصل زمانے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کے لیڈروں کو اس میں جو خطاب ہے اس کی نوعیت وداعی خطاب کی ہے، گویا ان سے متعلق پیغمبرؐ کی جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہوگئی، اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اگر انھوں نے یہ ذمہ داری اب بھی محسوس نہ کی تو اس کے نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اسی طرح مسلمانوں سے متعلق اس میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اب وہ ایک ایسے دور میں داخل ہو رہے ہیں جس میں ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی کی شکل میں اپنے فرائض ادا کرنے ہیں جس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں بار بار یہ تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری ذمہ داری لوگوں کو واضح طور پر حق پہنچا دینے کی تھی وہ تم نے پوری کر دی۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اسی ضمن میں بعض اعتراضات کے جواب بھی دیے گئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر مخالفین کی طرف سے کیے گئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۱۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جس دینِ توحید کی وحی اللہ نے تم پر کی ہے اسی دین کی وحی اس نے تم سے پہلے آنے والے رسولوں پر بھی کی اور وحی کا طریقہ بھی وہی ہے جو اس سے پہلے اختیار کیا گیا۔ اللہ کی ذات بہت بلند اور عظیم ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ آسمان اس کی خشیت سے پھٹا جا رہا ہے اور فرشتے برابر اس کی تسبیح اور اہلِ زمین کے لیے استغفار میں سرگرم ہیں۔ جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ ان کے ایمان کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔ اللہ نے جو عربی قرآن تم پر اتارا ہے اس کے ذریعہ سے اہلِ مکہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو اس دن سے آگاہ کر دو جس دن وہ سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر ایمان لانے والوں کو جنت میں اور کفر کرنے والوں کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری تمھارے اوپر نہیں ہے۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتی۔ ہدایت وہی پائیں گے جو اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۱۱ - ۲۰) آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے، ان کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اولاد اور رزق خدا ہی بخشتا ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی دینِ توحید کی تعلیم تمام نبیوں نے دی اور اسی پر قائم رہنے اور اس میں اختلاف نہ پیدا کرنے کی انھوں نے برابر تلقین کی۔ جن لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا انھوں نے خدا کی طرف سے صحیح علم آجانے کے بعد محض باہمی عناد اور تعصب کے سبب سے پیدا کیا۔ اگر اللہ نے اس جھگڑے کے فیصلہ کے لیے ایک وقت نہ مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا فیصلہ فوراً کر دیا جاتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم اسی دینِ انبیاء کی دعوت دو اور اسی پر جمے رہو اور لوگوں کو آگاہ کر دو کہ اللہ نے جو کتاب میزانِ عدل بنا کر اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ اسی میزانِ عدل کے ذریعہ سے تمھارے درمیان فیصلہ کروں۔ جو لوگ اس کے بعد بھی تم سے جھگڑیں ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ انھیں متنبہ کر دو کہ قیامت کو بہت دور نہ سمجھیں۔ اللہ نے جو مہلت بخشی ہے اس سے فائدہ اٹھا لیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ نہایت مہربان بھی ہے اور نہایت منتقم و قہار بھی۔ اگر وہ لوگوں کو، ان کے طغیان و فساد کے باوجود مہلت دیتا ہے تو اپنی سنت کے مطابق دیتا ہے۔ اس مہلت کے بعد وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔

(۲۱ - ۲۶) اگر انھوں نے کچھ شرکا ایجاد کیے ہیں جنھوں نے اللہ کے رسولوں کے لائے ہوئے دین سے کوئی الگ دین ان کے لیے ایجاد کیا ہے تو یہ دین اور ان کے یہ شرکاء قیامت کے دن کچھ بھی ان کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن مشرکین اپنے انجام پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے ہوگی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میں تمھاری ہدایت کے لیے جو اتنا فکرمند ہوں تو اس لیے نہیں کہ میں تم سے کسی صلہ کا طالب ہوں بلکہ یہ محض حقِ قرابت ہے جو تمھارے لیے مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ گے

تو اس کا صلہ تم خود پاؤ گے۔ اگر یہ لوگ تمھاری دعوت کو افترا بتاتے ہیں تو تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ چشمۂ فیض تمھارے اندر خدا نے جاری کیا ہے، اگر وہ چاہے تو ابھی اس کو بند کر دے، پھر تم کسی طرح بھی اس کو جاری نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں دیکھنے کی چیز اس کے اثرات اور اس کی برکات ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کو سربلند کر رہا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بھی کہیں اس کی پروا نہ کرو، جن کے اندر صلاحیت ہے وہ اس کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ تمھارے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے۔

(۲۶-۲۷) اگر یہ لوگ اپنی دنیوی برتری کو اپنے برحق ہونے کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں تو ان کو بتا دو کہ آخرت کی نعمتوں کے مقابل میں اس دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شیطان کے فتنوں سے بچانا چاہا اس وجہ سے دنیا کے طالبوں کو بھی اتنا ہی دیتا ہے جتنا اس کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے ورنہ وہ ان کو پوری ڈھیل دے دیتا کہ وہ اس دنیا میں سے جتنا چاہیں اپنے دامن بھر لیں — اللہ کی ڈھیل سے کسی کو غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جب چاہے لوگوں کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ لوگوں کی ناشکری اور ان کے طغیان کے باوجود ان سے درگزر کرتا ہے۔ انسان کی روزمرّہ کی زندگی میں جو تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں اگر کوئی دیدۂ بینا رکھتا ہو تو انھی کے اندر دیکھ سکتا ہے کہ انسان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے۔ اگر خدا حفاظت نہ کرے تو انسان کے تمام وسائل اس کی حفاظت سے قاصر ہیں۔ کافروں کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ عارضی و فانی ہے۔ خدا کے ہاں ابدی بادشاہی ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو ایمان لائیں گے اور خدا پر بھروسہ رکھیں گے۔

(۳۷-۴۳) اہل ایمان کی حقیقی صفات کا بیان اور ان کو چند خاص ہدایات جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات میں ان کی رہنمائی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری تھیں۔ قرینہ دلیل ہے کہ اس دور میں کفار کی تعدّیاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور مسلمان بھی ایک جماعت اور تنظیم کی شکل اختیار کر رہے تھے اس وجہ سے ان کو ضروری ہدایات سے آگاہ کر دیا گیا تاکہ اس نازک دور میں ان کا کوئی قدم غلط نہ اٹھ جائے۔

(۴۴-۵۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے مخالفین کو تنبیہ ہے۔ اس کے بعد ان کو دعوت ہے کہ اب بھی موقع ہے کہ پیغمبر کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر یہ کبھی واپس آنے والا نہیں ہے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر ہے کہ اگر یہ لوگ تمھاری بات نہیں سن رہے ہیں تو ان کا پیچھا چھوڑو، تمھارے اوپر جو ذمہ داری تھی وہ تم نے ادا کر دی، ان کے دلوں میں ایمان اتار دینا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ انسان کی تنگ ظرفی کا حال یہی ہے اگر اللہ اس کو اپنی رحمت سے نوازتا ہے تو اتراتا اور اکڑتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی مصیبت پیش آ جائے تو مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے مزعومہ شریکوں پر بڑا ناز ہے لیکن خدا کا کوئی شریک نہیں

ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے غرور کے سبب سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ خدا ان سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو ان
کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے بات کرتا ہے صرف وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے
اور اس کے خاص طریقے ہیں۔ اسی طرح کی وحی اس نے تم پر بھی کی ہے اور یہ تم پر اور تمھارے واسطہ سے
لوگوں پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے نہ تم کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان کی تفصیلات
اور اس کے مطالبات سے۔

سُوْرَةُ الشُّوْرٰی (٤٢)

مَکِّیَّۃٌ ——— اٰیات : ٥٣

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ١ - ١٠

حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② کَذٰلِکَ یُوْحِیْٓ اِلَیْکَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۙ اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ③ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ④ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِھِنَّ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ⑤ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیْظٌ عَلَیْھِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ ⑥ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ⑦ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ⑧ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ھُوَ الْوَلِیُّ وَھُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ۫ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ⑨ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْہِ

ع ١ / ٢

مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ⑩

ترجمہ آیات ۱ - ۱۰

یہ حٰم ۔ عٓسٓقٓ ہے ۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم وحی کرتا ہے تمھاری طرف اور اسی طرح وہ وحی کرتا رہا ہے ان کی طرف جو تم سے پہلے گزرے ۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بڑی ہی بلند اور عظیم ہستی ہے ۔ قریب ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں ۔ آگاہ کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا اللہ ہی ہے ۔ اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اللہ ان پر نگرانی رکھے ہوئے ہے اور تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کیے گئے ہو ۔ ۱ - ۶

اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف ایک عربی قرآن وحی کیا ہے تاکہ تم اہل مکّہ اور اس کے گرد و پیش والوں کو آگاہ کر دو اور اس دن سے ڈرا دو جو سب کے اکٹھے کرنے کا دن ہو گا جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے ۔ اس دن ایک گروہ جنت میں داخل ہو گا اور ایک گروہ دوزخ میں ۔ ۷

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امّت بنا دیتا لیکن وہ داخل کرتا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہتا ہے اور جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہو گا اور نہ مددگار ۔ کیا ان لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یاد رکھیں کہ کارساز اللہ ہی ہے اور وہ مُردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس کسی چیز میں بھی تم نے اختلاف کیا ہے تو اس کا فیصلہ اللہ کے

حوالہ ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ ۸-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حٰمٓ ۚ عٓسٓقٓ (۱-۲)

یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ یاد ہوگا، پچھلی دو سورتوں کا نام بھی 'حٰمٓ' ہی ہے۔ یہاں اس پر 'عٓسٓقٓ' کا اضافہ ہے۔ ناموں کا اشتراک عمود کی وحدت پر دلیل ہے اور یہ اضافہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سورہ میں کچھ خاص مطالب بھی ہیں جو پچھلی دونوں سورتوں میں نہیں ہیں چنانچہ مطالب کے تجزیہ پر ایک نظر ڈال کر ان خاص مطالب کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُوحِيٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳)

'كَذٰلِكَ' کا اشارہ ان مطالب کی طرف ہے جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ان مطالب کا ایک اجمالی تصور اس سورہ کے نام نے دے دیا ہے اس وجہ سے 'كَذٰلِكَ' کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ بالکل موزوں ہے یعنی اس نام سے موسوم سورہ میں جو باتیں وحی کی جا رہی ہیں یہ جس طرح تمھاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اسی طرح تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی وحی کی جا چکی ہیں۔ ادائے مطلب میں بتقاضائے بلاغت ایجاز ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ اس طرح اللہ تم پر وحی کر رہا ہے اور اسی طرح اس نے ان نبیوں پر بھی وحی کی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؛ اس قسم کے ایجاز کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔

تمام نبیوں کو یہی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور طریقۂ تعلیم بھی ایک ہی رہا ہے

'كَذٰلِكَ' وحدتِ مدعا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور طریقۂ وحی کی یکسانی کی طرف بھی یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں اور رسولوں کو تعلیم بھی انہی باتوں کی دی جن کی تعلیم تم کو دی جا رہی ہے اور اس تعلیم کے لیے طریقہ بھی وہی اختیار فرمایا جو تمھارے لیے اختیار فرمایا اس وجہ سے کسی پہلو سے بھی قرآن میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لوگوں کے لیے باعث وحشت ہو۔ اگر یہ اس سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی طبیعت کا فساد ہے۔

وحدتِ مدعا کی طرف اشارہ

وحدتِ مدعا کی طرف آگے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ — تمھارے لیے اس نے اسی دین کو مقرر کیا جس کی تعلیم نوح کو دی اور اسی کی وحی ہم نے تم کو کی اور جس کی تلقین

إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ...... (۱۳)

ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی کی کہ اللہ کے دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ برپا کرو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس اسلام اور جس دینِ توحید کی دعوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اسی کی دعوت پر تمام انبیاء علیہم السلام مامور ہوئے لیکن مشرکین نے جو دینِ شرک ایجاد کیا اس کی عصبیت کے جوش میں اس دینِ حق کے مخالف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی قسم کی عصبیت کے جنون میں اہلِ کتاب بھی مبتلا ہو گئے۔

طریقہ کی یکسانی کی طرف اشارہ

طریقہ کی یکسانی کی طرف آگے اس سورہ میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ (۵۱-۵۲)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے مگر یہ کہ وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی اوٹ سے یا بھیجے اپنا کوئی فرشتہ پس وہ وحی کردے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ بے شک وہ بڑا ہی بلند اور حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف بھی وحی کی ایک روح کی اپنے امر میں سے۔ تم نہ کتاب سے آشنا تھے اور نہ ایمان سے لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ آج جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر خدا پیغمبر سے کلام کرتا ہے تو ان سے بھی کلام کرے یا وہ اس طرح نمودار ہو کہ وہ اس کو دیکھیں اور اس کا کلام سنیں، یہ محض ان کی خودسری اور بد دماغی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرح نہ کسی سے بات کرتا اور نہ اس طرح جلوہ نمائی کرنا اس کی شان ہے، بلکہ ہمیشہ سے اس کا طریقہ یہ رہا کہ اس نے اپنے جن بندوں کو نبوت کے کارِ خاص کے لیے منتخب فرمایا ان سے وحی کے ذریعہ سے بات کی اور اس وحی کا ایک خاص ضابطہ ہے۔

آنحضرت صلعم کے لیے تسلی اور مخالفین پر اتمام حجت

اس بات کے کہنے سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی ہے اور مخالفین پر اتمام حجت بھی۔ ظاہر ہے کہ جب آپ اسی دینِ حق کی دعوت دے رہے ہیں جس کی دعوت تمام نبیوں اور رسولوں نے دی تو آپ کوئی ایسی بات نہیں پیش کر رہے ہیں جس سے لوگ وحشت زدہ ہوں۔ جو لوگ اس سے وحشت زدہ ہیں وہ تمام نبیوں کی دعوت کے مخالف اور تعصب و عناد میں مبتلا ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر آپ

لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ نہیں کرا سکتے یا اس کو کلام کرتے دوسروں کو سنا نہیں سکتے تو یہ چیز بھی آپ کی نبوت، کا کوئی نقص نہیں۔ آپ اللہ کی وحی پیش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس سے بھی بات کرتا ہے وحی کے ذریعہ ہی سے کرتا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کسی کو بھی نہیں نوازتا۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے 'عزیز و حکیم' کا حوالہ یہاں تسلی کے مضمون سے بھی تعلق رکھتا ہے اور تہدید کے مضمون سے بھی۔ جب اللہ تعالیٰ 'عزیز' ہے تو وہ گردن کشوں کو جب چاہے دبا سکتا ہے۔ اگر وہ فوراً نہیں دباتا تو وہ اپنی حکمت کے تحت ان کو مہلت دے رہا ہے اس وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے رب عزیز و حکیم پر بھروسا رکھنا اور ان لوگوں کا معاملہ اسی کے حوالہ کرنا چاہیے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۴)

صفت 'عزیز' کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کی صفت 'عزیز' کی وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نہ کسی چیز میں کسی کا ساجھا ہے اور نہ کوئی چیز اس کے حیطۂ اقتدار و اختیار سے باہر ہے۔ وہ بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہستی ہے، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہمسر ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگوں کو مہلت دے رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لوگ اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو گئے اور اگر اس نے کسی کو عزت و شوکت بخشی ہے تو اس کو اتنا مغرور نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خدا کو دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا حوصلہ کر بیٹھے۔ اللہ کی بارگاہ بہت بلند اور اس کی ہستی بڑی عظیم ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۵)

'علی' و 'عظیم' کی وضاحت

یہ خدائے 'علی و عظیم' کے علو اور اس کی عظمت کا بیان ہے کہ اس کی عظمت کے بوجھ سے آسمانوں کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر سے پھٹ پڑیں گے اور ملائکہ کا حال' بایں ہمہ قربت' یہ ہے کہ اس کی خشیت کے سبب سے وہ ہر وقت، اس کی تسبیح و تحمید میں لگے رہتے اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ یعنی نادانوں نے تو فرشتوں کو خدائی میں شریک بنا رکھا ہے اور یہ توقع لیے بیٹھے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں ان کو وہ مقام حاصل ہے کہ وہ اپنے پجاریوں کو بڑے بڑے مرتبے دلوائیں گے اور خود ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس کی خشیت سے لرزاں و ترساں اور مصروف تسبیح و تحمید ہیں۔

'تسبیح' اور 'حمد' کے فرق پر اس کے محل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ 'تسبیح' میں تنزیہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' میں اثبات کا۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو تمام خلاف شان باتوں سے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شرک ہے، پاک اور تمام اعلیٰ صفات سے، جن میں سب سے مقدم توحید ہے، متصف ٹھہراتے ہیں۔

'وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ' میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو سورۂ مومن میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... (۷)

جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے اس پر ایمان رکھتے اور ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

ملائکہ کا استغفار اہلِ زمین کے لیے

اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ اہلِ زمین میں سے ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو اہلِ ایمان ہیں۔ چونکہ یہ بات واضح تھی اس وجہ سے آیت زیرِ بحث میں یہ حذف کر دی گئی ہے۔ ملائکہ کا یہی استغفار ان کی شفاعت ہے جو وہ اپنے رب کی بارگاہ میں اہلِ ایمان کے لیے کر رہے ہیں۔ اس سے مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی تردید ہو گئی۔

'اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ' یہ مشرکین کو ایک برمحل تنبیہ ہے کہ کان کھول کر اچھی طرح سن لو کہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا اللہ ہی ہے۔ اگر یہ چیز فرشتوں کے اختیار میں ہوتی تو وہ اس تذلل کے ساتھ لوگوں کی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے کیوں درخواست کرتے؟

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۶)

مشرکین کو نہایت سخت وعید

یہ مشرکین کو نہایت سخت انداز میں وعید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں اور تمام تنبیہ و تذکیر کے باوجود اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، اللہ ان کی کڑی نگرانی کر رہا ہے کہ جونہی وہ اپنی مہلت پوری کر لیں ان کو اپنے قہر و غضب کے پنجہ میں گرفتار کر لے۔ اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ خدا نے تم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی ہے کہ لازماً تم ان کو ایمان کی راہ پر لگا ہی دو۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغ حق کی تھی وہ تم نے کر دی اور جب تک تمہارے رب کا حکم ہے، کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش انہی سے ہونی ہے تم سے نہیں ہونی ہے۔ یہی مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ...... (۴۸)

پس اگر یہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ہے، تمہارے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ (۷)

اس 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ آیت ۳ کے مضمون کی طرف ہے کہ جس طرح ہم نے تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو اپنی وحی سے سرفراز کیا اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی یہ قرآن بزبان عربی اتارا ہے تاکہ

تم عرب کی مرکزی بستی اور اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو آگاہ کر دو۔

قرآن کے ساتھ 'عربی' کی صفت بطور امتنان اور اتمام حجت ہے، جیسا کہ حٰم السجدۃ کی آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے کہ اہل عرب کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے کہ ان کے لیے اللہ کے دین کی پوری وضاحت نہیں کی گئی۔

'ام القریٰ' میں اتمام حجت کا پہلو

'اُمُّ الْقُرٰی' سے مراد مکہ ہے اس لیے کہ 'اُمُّ الْقُرٰی' مرکزی بستی کو کہتے ہیں اور عرب میں مرکزی بستی کی حیثیت مکہ ہی کو حاصل تھی۔ یہاں مکہ کے بجائے 'اُمُّ الْقُرٰی' کے لفظ میں بھی اتمام حجت کا پہلو ہے۔ اگر ایک پیغام مرکزی بستی کے لوگوں کو پہنچا دیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کے لوگوں کو ان کے سر پر چڑھ کر لکار دیا گیا ہے۔ اگر 'اُمُّ الْقُرٰی' کے بجائے عرب کے کسی گوشے سے یہ دعوت اٹھتی تو باتیں بنانے والے یہ بات بنا سکتے تھے کہ آخر ہمارے اکابر و سادات اور ہمارے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر قرآن نے سب سے پہلے عوام کے طبقہ کو کیوں مخاطب کیا، اس کے حق و باطل کے اصلی پرکھنے والے تو مکہ کے سادات ہو سکتے تھے!

'ومن حولھا' سے کیا مراد ہے؟

'وَمَنْ حَوْلَهَا' سے بعض لوگوں نے تمام عالم کو مراد لیا ہے۔ ان کے اس خیال کی بنیاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی ہے، اس وجہ سے صرف اطراف مکہ یا ملک عرب ہی کے شہر مراد نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا مراد ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت خاتم النبیین ہیں، اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام عالم کے لیے ہوئی، لیکن 'مَنْ حَوْلَهَا' کی یہ تاویل الفاظ کے حدود سے اول تو صریح تجاوز ہے پھر اصل مقصد کے لیے اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ آپ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں۔ ایک بعثت خاص، دوسری بعثت عام۔ آپ کی بعثت خاص اہل مکہ اور اہل عرب کی طرف ہوئی اور ان پر آپ نے براہ راست، حجت تمام فرمائی۔ رہی آپ کی بعثت عام تو وہ تمام عالم کی طرف ہے اور اہل عالم پر دین حق کی شہادت دینے کی ذمہ داری قرآن نے بھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی، قیامت تک کے لیے ملت مسلمہ پر ڈالی ہے اور اس ذمہ داری ہی کی بنا پر اس امت کو اللہ تعالیٰ نے 'شُهَدَآءَ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ' کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔ یہ اس امت کا فریضۂ منصبی ہے کہ اللہ کے رسول نے دین حق کی گواہی جس طرح اس امت کے لوگوں پر دی اسی طرح یہ برابر دوسروں کے سامنے یہ گواہی دیتی رہے۔ اسی فریضہ کے تقاضے سے اس امت کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ ایک گروہ اس میں ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ اس وقت بھی حق پر قائم رہے گا جب دنیا کی رگ رگ میں باطل کا زہر سرایت کر جائے گا۔[1]

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب 'دعوت دین اور اس کا طریق کار' میں کر چکے ہیں۔ جن لوگوں کو دلائل کی تفصیل مطلوب ہو اس کی مراجعت کریں۔

عدالتِ عام سے انذار

'وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ'۔ انذارِ عام کے بعد یہ انذارِ خاص کا ذکر ہے کہ ان لوگوں کو خاص طور پر 'یوم الجمع' سے ڈرا دو۔ 'یوم الجمع' سے اشارہ ظاہر ہے کہ روزِ قیامت کی طرف ہے۔ روزِ قیامت کو 'یوم الجمع' سے تعبیر کرنے میں اس بات کی آگاہی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ بلا استثنا سب کو اکٹھا کریگا۔ عابدوں کو بھی اور معبودوں کو بھی؛ لیڈروں کو بھی، ان کے پیرؤوں کو بھی؛ انبیاء اور ان کے ساتھیوں کو بھی؛ کفار اور ان کے حمایتیوں کو بھی۔ اور ان سب کی موجودگی میں، بھری عدالت میں، فیصلہ فرمائے گا کہ اللہ کے دین کے معاملے میں کس کا رول کیا رہا ہے؟ کس نے اس میں اختلاف برپا کیا اور فساد ڈالا اور کس نے اس کی وحدت و پاکیزگی قائم رکھنے کی کوشش کی۔ کون انعام کا مستحق ہے اور کون سزا کا؟

'فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ'۔ یہ اس کھلی عدالت کے فیصلہ کا بیان ہے کہ اس دن ایک گروہ یعنی اہلِ ایمان کا گروہ لازماً جنت میں جائے گا اور دوسرا گروہ یعنی اہلِ کفر کا گروہ لازماً دوزخ میں۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۸)

ایک شبہ کا جواب

اب یہ ایک شبہ کا جواب دیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا تو اس نے یہ کیوں نہیں پسند فرمایا کہ سب اسی دین پر رہتے؟ اس نے یہ موقع کیوں دیا کہ لوگ اس میں اختلاف برپا کریں اور اس اختلاف کا نتیجہ بالآخر یہ نکلے کہ ایک گروہ تو جنت کا حقدار ٹھہرے اور دوسرا دوزخ کا سزاوار قرار پائے؟

اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں پسند فرمایا کہ وہ لوگوں کو اپنی ہدایت قبول کرنے پر مجبور کرے بلکہ اس نے چاہا کہ لوگوں کو اختیار دے کہ ان کے سامنے اپنی ہدایت رکھے کہ لوگ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر، اپنی آزادی رائے کے ساتھ، ہدایت کو اختیار کریں اور اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے سزاوار بنیں۔ 'يُدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ' میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جس مشیت کا ذکر فرمایا ہے وہ اس کی رحمت اور اس کے عدل کے تحت ہے۔ اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جن کے لیے اس کا عدل مقتضی ہو کہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہوں ان کو وہ اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اس مضمون کو اس کے بعد 'وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ' فرما کر واضح بھی کر دیا کہ جو لوگ ظالم یعنی کافر و مشرک ہیں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا، نہ کوئی مددگار، یعنی نہ ان کے مزعومہ اولیا، ان کے کام آنے والے بنیں گے اور نہ ان کی کوئی جمعیت و جماعت ہوگی جو ان کی کوئی مدد کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف وہ لوگ محروم ہوں گے جو ظالم و مشرک ہوں گے اور ایسا اس لیے ہوگا کہ یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اس کی مشیت اس کے عدل پر مبنی ہے اور کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کی مشیت کو بدل سکے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور اس کتاب میں بار بار اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ ہم مزید وضاحت کے لیے یہاں بھی چند آیات کا حوالہ دیے دیتے ہیں۔ سورۂ یونس میں فرمایا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس : ۹۹-۱۰۰)

اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جو بھی ہیں سب ایمان پر ہوتے تو کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مومن بن جائیں اور کوئی جان بھی ایمان نہیں لاسکتی مگر اللہ کے اذن سے اور اللہ ان لوگوں پر گندگی لاد دیتا ہے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے اور اس کی مشیت ان لوگوں کو ایمان کی توفیق بخشتی ہے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے ان کی عقل ایسی گندگی کے ڈھیر کے نیچے دب جاتی ہے کہ ان کو ایمان و ہدایت کی روشنی نظر نہیں آتی۔

یہی مضمون سورۂ سجدہ میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا (السجدۃ : ۱۳)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اس کی ہدایت دے دیتے۔

یعنی اگر ہم لوگوں کو ایمان پر مجبور کرنا چاہتے تو سب کو مومن بنا دیتے لیکن ہم نے لوگوں کو اختیار دے کر آزمایا ہے کہ کون ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے، کون کفر کی۔ پس جو کفر کی راہ اختیار کریں گے ہم ان سب کو جہنم میں بھر دیں گے اور ان لوگوں کو جنت میں داخل کریں گے جو ایمان لائیں گے۔

یہی بات نہایت وضاحت سے سورۂ دہر میں اس طرح ارشاد ہوئی ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (الدھر : ۲۹-۳۱)

یہ قرآن تو بس ایک یاددہانی ہے تو جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ بھی چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ رہے اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تو ان کے لیے اللہ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو تسلی دی گئی ہے کہ لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہو۔ یہ قرآن لوگوں پر زبردستی لادنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف ایک یاددہانی ہے

تو اس کے ذریعہ سے لوگوں کو یاد دہانی کرو۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے۔ اگر تم لوگ ان کے ایمان کے خواہشمند ہو تو تمھاری خواہش سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو اور اللہ کی مشیت اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ وہ اپنی رحمت میں انہی کو داخل کرتا ہے جن کو چاہتا ہے اور وہ انہی کو چاہتا ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے اور اس کی ہدایت کی قدر کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن کر چلتے ہیں تو ایسے ظالموں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۹)

سوال یہاں اظہارِ تعجب اور انکار کے مفہوم میں ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے نہ کوئی کارساز ہوگا، نہ مددگار۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں تو یہ محض ان کی لاابالی ہے۔ کارساز صرف اللہ ہی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ وہی ہے جو مردوں کو زندہ کرے گا اور ہر ایک کی پیشی اس کے حضور میں ہونی ہے تو کارساز کوئی دوسرا کیسے بن جائے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس کے ہوتے کسی کارساز کی ضرورت کیا رہی اور اس کے آگے کسی بڑے سے بڑے کارساز کی کارسازی کیا کارگر ہو سکتی ہے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۱۰)

ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ جو اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے

اوپر آیت ۸ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ مخالفین کی ضد اور مکابرت سے آپ پریشان نہ ہوں۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ نے جو سنت مقرر کر رکھی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہ لوگ اللہ کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے۔ اسی ہدایت کے بموجب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا معاملہ اللہ کے حوالہ فرمادیا۔ چونکہ یہ بات اوپر والی آیت ہی کی تعمیل میں تھی اس وجہ سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نئی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی بلکہ کہنے کی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلا دی گئی۔ فرمایا کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کی جس بات میں بھی تم نے اختلاف کیا، خواہ وہ توحید ہو یا آخرت، میری ذمہ داری اس میں صرف حق پہنچا دینے کی تھی سو وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔ اب اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے۔ وہ فیصلہ فرمائے گا کہ میں نے حق پہنچانے میں کوتاہی کی یا تم نے حق کو پہچان کر اس کو جھٹلایا! وہی اللہ میرا رب ہے اس وجہ سے میں نے اس پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ وہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرمائے۔

۲- آگے کا مضمون —— آیات : ۱۱-۲۰

پہلے اسی توحید کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رزق اور اولاد سب اسی کا عطیہ ہیں۔ اور اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ واحد کی مشیت اور اس کے ارادہ کے سوا کوئی اور ارادہ اس کے اندر دخیل نہیں ہے۔

اس کے بعد پہلی آیت کے مضمون کی وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں نے اسی دینِ توحید کی دعوت دی اور اس میں اختلاف برپا کرنے سے لوگوں کو روکا لیکن ان کی امتوں نے خدا کی طرف سے واضح علم آ جانے کے باوجود اس میں اختلاف پیدا کیا اور اپنے آپ کو اللہ کی ہدایت سے محروم کر لیا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ انبیاء کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنی اس دعوت پر جمے رہو۔ جو لوگ تمھاری مخالفت کر رہے ہیں ان کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اس نے تمھارے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے، میزانِ عدل بنا کر، اتاری ہے۔ اگر تم اس کے فیصلہ کو قبول نہیں کرو گے تو قیامت کی میزان تمھارا فیصلہ کرے گی اور قیامت شدنی ہے۔ اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل نہ سمجھو۔ اللہ حق کے دشمنوں کو بھی دنیا کی نعمتیں دیتا ہے لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۲۰

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ

يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا
تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾
فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ
اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ
رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ
فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ
قَرِيْبٌ ﴿۱۷﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ
يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۸﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ
يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ
الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا
نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾

ع ۲

ترجمہ آیات ۱۱—۲۰

وہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے

جوڑے پیدا کیے اور چوپایوں کی جنس سے بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس مزرعہ کے اندر وہ تمہاری تخم ریزی کرتا ہے۔ اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔ اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں۔ وہ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱۱-۱۲

اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کیجیو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف رہنمائی ان کی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۳

اور یہ لوگ صحیح علم آچکنے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے باعث متفرق ہوئے اور اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات ایک مدتِ معین کے لیے طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کے درمیان فوراً فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ اس کے باب میں ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ ۱۴

پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔

ہمارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ ۱۵

اور جو لوگ اللہ کے باب میں حجّت کر رہے ہیں بعد اس کے کہ اس کو مانا جا چکا ہے، ان کی حجّت ان کے رب کے آگے بالکل لچر ہے اور ان پر غضب اور ان کے لیے عذاب شدید ہے۔ ۱۶

اللہ ہی ہے جس نے اتاری کتاب قولِ فیصل کے ساتھ اور میزان اتاری اور کیا عجب شاید قیامت بھی قریب ہی آ لگی ہو۔ اس کے لیے جلدی وہ لوگ مچائے ہوئے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ترساں ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ شدنی ہے۔ آگاہ کہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں وہ بہت دُور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۱۷-۱۸

اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ رزق بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ نہایت زور آور اور غالب ہے اور جو آخرت کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کی کھیتی میں افزونی دیتے ہیں (اور دنیا میں سے بھی اس کا حصّہ دیتے ہیں) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہوتا ہے ہم اس کو اس میں سے کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصّہ نہیں۔ ۱۹-۲۰

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۱۱)

اللہ تعالیٰ کی یکتائی کی دلیل

اوپر آیت ۱۰ میں یہ جو فرمایا ہے۔ 'ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیْ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ' اس کی یہ مزید وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق اور تمام انسانوں اور دوسری مخلوقات، کو وجود میں لانے والا وہی ہے۔ دوسرا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی ذات یا صفات میں اس کا مثیل ہو سکے تو کوئی اور کس طرح حقدار ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کا شریک ٹھہرایا اور مولیٰ و مرجع بنایا جائے!

'یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ' میں ضمیر مجرور کا مرجع الفاظ کے اندر نہیں ہے بلکہ اس مفہوم کے اندر ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور چوپایوں کے اندر ان کی جنس سے جو جوڑے پیدا کیے ہیں تو اس طرح گویا انسانوں اور چوپایوں کی تخلیق کے لیے ان کے اپنے نوعی نظام کے اندر ہی ایک فارم یا مزرعہ بنا دیا ہے جس میں وہ ان کی برابر تخم ریزی کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ عربی زبان میں اس طرح ضمیریں آتی ہیں۔ اس کتاب میں اس کی بعض نہایت واضح مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ' اوپر والے ٹکڑے میں خالقِ آسمان و زمین کی جس قدرت و حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین جیسی عظیم چیزیں پیدا کیں، جس نے انسانوں اور چوپایوں کی نسل چلانے کے لیے یہ حیرت انگیز نظام قائم فرمایا آخر دوسرا کون ایسا ہو سکتا ہے جس کو اس کا مثل قرار دیا جا سکے؟ کوئی چیز بھی نہ اس کے مثل ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں بالکل یکتا ہے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جب آسمانوں کا خالق وہ ہے تو ان سے جو کچھ اترتا ہے اس کا اتارنے والا بھی وہی ہے، جب زمین کا بنانے والا وہ ہے تو اس سے جو کچھ برآمد ہوتا ہے اس کا برآمد کرنے والا بھی لازماً وہی ہے۔ جب عورت اور مرد، نر اور ناری کا خالق وہ ہے تو جو خلق ان سے وجود میں آتی ہے ان کا وجود میں لانے والا بھی وہی ہوا۔ مطلب یہ نکلا کہ جب آسمانوں اور زمین اور عورت و مرد کا خالق خدا کے سوا کسی دوسرے کو نہیں قرار دیا جا سکتا تو ان کے باہمی تفاعل سے وجود میں آنے والی چیزوں کو کس طرح کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے؟ کون ہے جس نے ان کاموں میں سے کوئی ایک بھی کیا ہو یا کر سکے جو خدا نے کیے ہیں کہ اس کو اس کا ہم پایہ بنا دیا جائے؟

'وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ' یہ اس سبق سے نکلا ہوا آگے کا سبق ہے کہ جس طرح اس کائنات کے مشاہدے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کوئی اس کا مثیل نہیں ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی اس سے نکلتی ہے کہ حقیقی سمیع و بصیر وہی ہے۔ ایک سمیع و بصیر خالق ہی اتنی وسیع کائنات کو وجود میں لا سکتا ہے اور وہی اس کو برقرار بھی رکھ سکتا ہے ـــ تو جب اس کی قدرت بھی بے مثال اور اس کا علم بھی محیطِ کل تو سب اسی کی بندگی کریں اور اسی سے اپنی ضرورتیں مانگیں۔ وہ سب کی باتیں سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے اس سے

مانگنے کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۲)

جو خالق ہے وہی مالک بھی ہے

جب اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہی ان کا مالک بھی ہو۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کو پیدا تو کرے لیکن پیدا کرنے کے بعد ان کے خزانوں کی کنجیاں دوسروں کو پکڑا دے؟ اسی کے حکم سے بارش ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے زمین اپنے خزانے اگلتی ہے اور وہی ہے جو اپنے علم اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں کشادگی دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اس کے رزق کو تنگ کر دیتا ہے، نہ رزق کے پیدا کرنے میں کسی دیوی دیوتا کا کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تقسیم میں کسی کو دخل ہے۔ یہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں اس وجہ سے شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے بندوں کو اسی سے امید بھی رکھنی چاہیے اور اسی سے ڈرنا بھی چاہیے اور اگر کسی کے رزق میں تنگی ہو تو اس بدگمانی میں اس کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ خدا کو اس کی خبر نہیں ہے یا اس نے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہے بلکہ یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے خدا کے علم سے ہو رہا ہے اور اسی میں حکمت ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۱۳)

یہی دین تمام نبیوں کا دین ہے

سورہ کی تمہید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ جو فرمایا ہے کہ تمھیں اسی دین حق کی وحی کی جا رہی ہے جس کی وحی تم سے پہلے آنے والے نبیوں اور رسولوں کو کی گئی، یہ اسی مضمون کی وضاحت قریش اور اہل عرب کو مخاطب کر کے کی جا رہی ہے کہ اللہ نے تمھارے لیے وہی دین پسند فرمایا ہے جو اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی وحی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کی جا رہی ہے۔ اسی دین کی تلقین ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو بھی کی گئی تھی۔ یہ کوئی ایسا دین نہیں ہے جو تمھارے لیے انوکھا اور اجنبی ہو بلکہ شروع سے لے کر اس آخری نبی تک سب کا دین یہی رہا ہے اور یہی اللہ کا حقیقی دین ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا حوالہ یہاں اس طرح دیا ہے کہ پہلے ابتدائی اور آخری کڑی یعنی حضرت نوحؑ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرمایا، پھر بیچ کے انبیاء میں سے تین جلیل القدر نبیوں —— حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام —— کا نام خاص طور پر لیا۔ اس اہتمام خاص کے ساتھ ان کے ذکر کی وجہ یہ ہے کہ انہی تین نبیوں کی پیروی کے مدعی اس وقت قرآن کے سامنے تھے۔ مشرکین عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ

بالترتیب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے۔ اس طرح گویا نبیوں کی پوری تاریخ کی طرف بھی اجمالی اشارہ ہوگیا اور تقابلِ ذکر امتیں بھی سامنے آگئیں۔

اس دین سے متعلق امتوں کو ہدایت

'اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ' یہ اس دین کا بھی بیان ہے جس کی تلقین ان نبیوں کو کی گئی اور اس ہدایت کا بھی جو اس دین سے متعلق ان نبیوں کے واسطہ سے ان کے پیروؤں کو کی گئی۔ 'الدِّیْن' پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح 'الکتاب' پر ہے۔ جس طرح 'الکتاب' کے معنی اللہ کی کتاب کے ہیں اسی طرح 'الدین' کے معنی اللہ کے دین کے ہیں۔ اللہ کا دین شروع سے اسلام ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: 'اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ' (اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے)۔ اس دین کی بنیاد خالص اور کامل توحید پر ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی دیا اور یہی دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل فرمایا۔ اس کے عقائد اور اس کی اساسات شروع سے آخر تک بالکل ایک ہیں۔ فرق اگر ہوا ہے تو جزئیاتِ شریعت میں ہوا ہے جس کو قرآن نے 'شرعۃ ومنہاج' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس دین سے متعلق امتوں کو یہ ہدایت بھی فرمائی گئی تھی کہ اس کو قائم رکھنا اور اس میں اختلاف اور تفرق نہ برپا کرنا۔ یہ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح فرمایا ہے کہ 'وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا' (آل عمران: ۱۰۳) (سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑو اور متفرق نہ ہو)۔ قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں، جو کرنے کی ہیں وہ دیانتداری اور راستبازی کے ساتھ کی جائیں۔ نیز لوگوں کی برابر نگرانی کی جائے کہ وہ اس سے غافل یا منحرف نہ ہونے پائیں۔ اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہلِ بدعت اس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کر سکیں۔

'لَا تَتَفَرَّقُوْا' کا مطلب یہ ہے کہ یہی دین حبل اللہ ہے اس وجہ سے سب کا فرض ہے کہ سب مل کر اس کو تھامیں۔ ایسا نہ ہو کہ جس کے ہاتھ میں جو رسی آجائے اسی کو وہ حبل اللہ سمجھ بیٹھے اور اس رسی کو چھوڑ دے۔ اگر اس حبل اللہ سے تعلق منقطع ہوا تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ پھر کوئی چیز بھی لوگوں کی شیرازہ بندی نہ کر سکے گی۔

وہ خاص چیز جس سے مشرکین کو چڑ تھی

'كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ' مشرکین سے مراد مشرکینِ قریش ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے اللہ نے دین تو وہی اتارا جو تمام انبیاء کا دین ہے اور اسی دین کی تعلیم ان کے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی دی ہے لیکن وہ چیز ان پر شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔

حضراتِ انبیاء کی اصل تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے لیکن قرآن نے بالعموم حضرت نوحؑ ہی سے آغاز فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے کی تاریخ بالکل پردۂ خفا میں ہے۔

'مَاتَدۡعُوۡهُمۡ اِلَيۡهِ' اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد توحید ہے۔ قرآن میں اس بات کی جگہ جگہ تصریح ہے کہ مشرکین کو سب سے زیادہ چڑ قرآن کی دعوتِ توحید ہی سے تھی۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

'اَللّٰهُ يَجۡتَبِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡۤ اِلَيۡهِ مَنۡ يُّنِيۡبُ' یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے معاملہ میں صبر کرو۔ تم ان کے ایمان کے کتنے ہی چاہنے والے بنو لیکن ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ کا چاہنا اس کی حکمت اور اس کی سنت کے تحت ہے۔ وہ اپنی طرف رہنمائی انہی لوگوں کی کرتا ہے جو خود بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جو اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ توفیقِ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ 'يَجۡتَبِىۡ' کے بعد 'اِلٰى' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تضمین ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ (۱۴)

امتوں کو ملامت

یہ ان امتوں کو ملامت ہے کہ انھوں نے علمِ الٰہی کی روشنی پانے کے بعد محض اپنی باہمی ضد م ضد کے باعث آپس میں اختلاف کیا اور گمراہی میں مبتلا ہوئیں۔ اگر رات کی تاریکی میں کوئی ٹھوکر کھا جائے تو اس کو ایک حد تک معذور قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص پورے دن کی روشنی میں، محض اپنی ضد کے سبب سے، ٹھوکر کھاتا ہے وہ اپنی اس حماقت کا خود ذمہ دار ہے۔ اس 'تفرق' کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہ اشارہ غالباً یہاں کافی ہو گا کہ یہود کے علماء اور فقہاء میں بالکل اسی طرح کے اختلافات برپا ہوئے جس طرح کے اختلافات ہمارے ہاں برپا ہوئے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس امت کے پاس قرآن محفوظ ہے اس لیے رفعِ اختلاف کی کسوٹی موجود ہے لیکن یہود نے تورات بھی ضائع کر دی اس وجہ سے ان کے اختلاف کے رفع ہونے کی کوئی شکل باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت عیسیٰ کی دعوت سے جو امت ظہور میں آئی اس کے اور یہود کے درمیان شروع ہی سے ایک چپقلش برپا رہی اور اس میں اصلی دخل علمائے یہود کے عناد کو تھا۔ وہ محض ضد اور حسد کے باعث ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد میں خود نصاریٰ کے اندر بے شمار فرقے پیدا ہو گئے اور پال نے ان کو تورات اور انجیل دونوں کی روشنی سے محروم کر دیا۔ اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کی روشنی دکھانی چاہی تو یہود اور نصاریٰ اور قریش تینوں نے مل کر اس روشنی کو گل کرنے کی جو سعیِ نامراد کی اس کی پوری تفصیل قرآن میں آپ پڑھ رہے ہیں۔ یہود کو قرآن سے اس بنا پر عناد تھا کہ مذہبی پیشوائی بنی اسماعیل کو منتقل نہ ہونے پائے اور قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو پرخاش تھی اس کے وجوہ خود ان سورتوں سے واضح ہیں۔ اسی صورتِ حال کو قرآن نے 'وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ

'الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے کہ جس امت نے بھی تفرق اور اختلاف کی راہ اختیار
کی ہے محض اپنی شامتِ اعمال اور باہمی عناد کے سبب سے اختیار کی ہے۔ جہاں تک اللہ اور اس
کے رسول کا تعلق ہے ان کی طرف سے برابر لوگوں کو صراطِ مستقیم ہی کی رہنمائی کی گئی۔

'وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ'۔ یہ ان امتوں کو زجر و توبیخ بھی ہے
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی کہ چونکہ تمھارے رب کی طرف سے یہ بات طے ہو چکی ہے
کہ اتمامِ حجت کے لیے ہر امت کو ایک خاص حد تک مہلت دی جائے گی اس وجہ سے ان کو مہلت دی جا
رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو بلا تاخیر ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔

'وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ'۔ اس ٹکڑے کا تعلق اوپر والے
جملے 'وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ' سے ہے۔ بیچ کا جملہ محض بطور جملہ معترضہ
اور بغرضِ تنبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آنے کے بعد ان ملتوں نے آپس میں جو اختلاف برپا
کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں جو لوگ کتاب یعنی تورات کے وارث ہوئے وہ اس تورات کی طرف سے
الجھن میں ڈال دینے والے شکوک میں مبتلا ہو گئے۔ یہ مضمون بعینہٖ سابق سورہ میں بھی انہی الفاظ گزر چکا
ہے: 'وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتُلِفَ فِيهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ
وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ' (حم السجدۃ: ۴۵) (اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تو اس
میں اختلاف پیدا کر دیا گیا، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کا جھگڑا
چکا دیا جاتا، اور بے شک وہ اس کی طرف سے ایک الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑ گئے ہیں) لفظ
'مریب' کی تحقیق اس کے محل میں بیان ہو چکی ہے۔ 'الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ' سے مراد یہود ہیں کہ اختلاف
میں جو اپنے اگلوں کے بعد تورات کے وارث ہوئے۔ چونکہ تورات ان کو بالکل متناقض شکل میں ملی اس
وجہ سے ان کا اس کی طرف سے شکوک میں مبتلا ہو جانا ایک امر فطری تھا اور یہ چیز مقتضی تھی کہ وہ اس
اختلاف کو رفع کرنے والی کتاب — قرآن — کی دل سے قدر کرتے لیکن انھوں نے محض ضد اور حسد
کے سبب سے اس کی مخالفت کی۔ عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے قرآن کو مراد لیا ہے لیکن اس کا
کوئی قرینہ نہیں ہے۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا
أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ
أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ (۱۵)

نبی کو استقامت کی تلقین

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ تم اسی دینِ حق کی دعوت دو جو تمام انبیاء کا مشترک دین
ہے اور تمھارے یہ مخالفین خواہ کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم ان کی مطلق پروا نہ کرو، بلکہ ٹھیک ٹھیک اسی

طرح جس طرح تمھیں ہدایت ہوئی ہے اس پر جمے رہو۔

'وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ'۔ یہ اس استقامت کی وضاحت اس کے منفی پہلو سے ہے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی اپنی خواہشوں کو دین بنانے کے لیے انھوں نے اللہ کے دین میں جو بدعتیں گھسائی ہیں ان کی پیروی نہ کرو۔ 'اھواء' سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، بدعات ہیں۔ اس لیے کہ بدعات تمام تر خواہشوں ہی سے وجود میں آتی ہیں۔

'وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ' یعنی ان لوگوں کو، جو تم سے اپنی ایجاد کردہ بدعات کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، بتا دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں؟

'وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ' یعنی میں تمھاری بدعات و خواہشات کی پیروی کرنے نہیں بلکہ تمھارے درمیان انصاف کرنے آیا ہوں۔ تم نے اللہ کے دین میں جو جھگڑے پیدا کر دیے ہیں، مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس جھگڑے کا فیصلہ کر کے بتاؤں کہ اس میں کیا حق ہے اور کیا باطل؟ سو تم مجھ سے اپنی بدعات کی پیروی کی توقع نہ رکھو بلکہ اگر توفیق ہے تو مجھ سے یہ جاننے کی کوشش کرو کہ تم میں سے کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور کتنا باطل اور اللہ کا اصلی اور بے آمیز دین کیا ہے؟

'اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ... الایۃ' یہ تنبیہ و تحذیر ہے کہ یاد رکھو کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اسی کے آگے ہماری بھی پیشی ہونی ہے اور اسی کے حضور میں تمھاری پیشی بھی ہو گی۔ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمھارا مولیٰ و مرجع کوئی اور ہو گا۔ اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہوں گے اور تم اپنے اعمال کے۔ اگر ہم نے تمھیں حق پہنچا دیا تو ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے، اب خدا کے سامنے تمھاری ذمہ داری ہمارے اوپر نہیں ہے بلکہ خود تمھارے اوپر ہے۔ اس کے نیک و بد کو تم خود بھگتو گے۔ سورۂ یونس میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے: 'وَاِنْ کَذَّبُوْکَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَکُمْ عَمَلُکُمْ اَنْتُمْ بَرِیْٓــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ' (یونس: ۴۱) (اور اگر وہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم بری ہو میرے عمل سے اور میں بری ہوں تمھارے اعمال سے)۔

'لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ' یعنی اتنی رد و قدح اور اتنی توضیح و تفصیل کے بعد بھی اگر بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی تو اب ہمارے اور تمھارے درمیان مزید طولِ کلام کی ضرورت نہیں رہی۔ اب معاملہ اللہ کے حوالہ ہے ـــــ وہ ہم سب کو اکٹھا کر کے فیصلہ کرے گا اور یاد رکھو کہ سب کا ٹھکانا اسی کی طرف ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَعَلَیْھِمْ غَضَبٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ (۱۶)

'مُحَاجّۃ' کے معنی مجادلہ اور کٹ حجتی کرنے کے ہیں اور 'فِی اللّٰہ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِی توحید اللّٰہ'۔ اس لیے کہ جھگڑا جن سے بھی تھا اللہ کے باب میں نہیں بلکہ اس کی توحید ہی کے باب میں تھا۔ اہل کتاب تو در کنار مشرکین عرب بھی خدا کے منکر نہیں تھے۔ لیکن خدا کو شرک کے ساتھ ماننا دین میں معتبر نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کی توحید کے ساتھ اس پر ایمان لایا جائے۔ اگر کوئی توحید کے معاملہ میں جھگڑتا ہے تو وہ گویا خدا ہی کے باب میں جھگڑتا ہے اور اسی کی نفی کر رہا ہے۔

'مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ' کا مفہوم کم و بیش وہی ہے جو 'مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ' کا ہے یعنی یہ جھگڑا خدا کو ماننے کے بعد اٹھایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام نبیوں کی تعلیم ایک ہی رہی ہے، سب نے توحید ہی کی دعوت دی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قریش، یہود اور نصاریٰ سب کے اصل اسلاف اللہ تعالیٰ کی توحید کو مان چکے ہیں۔ اب اس ماننے کے بعد اگر خدا کی توحید میں ان امتوں کی طرف سے یہ جھگڑے اٹھائے جا رہے ہیں تو یہ حجت نہیں بلکہ کٹ حجتی ہے اور یہ کٹ حجتی خدا کے آگے کام آنے والی نہیں بلکہ یہ لپا ہو کر رہے گی۔

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ط وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۱۷)

قرآن میزان ہے

'الکتٰب' سے مراد قرآن اور 'المیزان' اسی کا بیان ہے۔ فرمایا کہ امتوں کے باہمی اختلاف کو رفع کرنے اور حق و باطل کو ممیز کر دینے کے لیے اللہ نے قرآن اتارا ہے جو درحقیقت ایک میزانِ عدل ہے۔ اوپر آیت ۱۵ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو یہ اعلان کرایا گیا ہے کہ 'وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ' (اور یہ بتا دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں) یہ وہی بات دوسرے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس کام پر مامور فرمایا کہ ملتوں کے درمیان اللہ کے دین کے بارے میں جو اختلاف ہے آپ اس کا فیصلہ کریں تو ضروری ہوا کہ آپ کو ایک ایسی کتاب بالحق عطا ہو جو میزانِ عدل کا کام دے اور آپ اس پر پرکھ کر بتا سکیں کہ کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ قرآن کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کا ایک نام 'مُھَیْمِن' بھی ہے جس کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یہی مضمون سورۂ حدید میں بھی آیا ہے۔ 'وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ...' (۲۵) (اور ہم نے ان رسولوں کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری کہ لوگ ٹھیک نقطۂ عدل پر استوار رہیں)۔

'وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ' یہ فقرہ یہاں نہایت ہی جامع اور نہایت ہی بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو اس میزانِ عدل کے فیصلہ کے مطابق اپنے حق و باطل میں امتیاز

اور اپنے اختلافات کو رفع کر لیں گے ورنہ قیامت تو بہرحال فیصلہ کر کے رہے گی اور اس کے فیصلہ سے کسی کے لیے بھی فرار کی گنجائش نہیں ہو گی اور قیامت کو بہت دُور نہ سمجھو، کیا عجب کہ وہ بھی اب قریب آ لگی ہو۔ جو لوگ قرآن کی میزانِ عدل سے گریز کر رہے ہیں آخر قیامت کی میزان سے وہ کہاں بھاگیں گے!

یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ (۱۸)

یعنی یہ لوگ قیامت کو محض ایک خیالی ڈراوا سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے بلکہ ڈھیٹ ہو کر یہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی؟ فرمایا کہ جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ محض ایک مذاق ہے۔ مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کی ہولناکی کو سمجھتے اور اس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ: یہ ان لوگوں کی محرومی پر اظہارِ حسرت ہے جو قیامت جیسی واضح حقیقت کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب ان کے کھلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلکہ ہر ایک کے سامنے اس کا انجام موجود ہو گا جس سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں ہو گا۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (۱۹)

نافرمانوں کو ڈھیل دینے کی حکمت

یہ سبب بیان فرمایا ہے اس بات کا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور شریروں کو اتنی ڈھیل دیتا ہے کہ وہ دلیر ہو کر عذاب اور قیامت کے لیے جلدی مچاتے اور اس کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ وہ رحمت کرنے میں سبقت کرتا ہے، عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ نافرمانوں کی نافرمانی کے باوجود ان کو رزق دیتا رہتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ و اصلاح کر لیں اور اپنے رب کی ابدی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔

وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ: اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا نہایت ہی قوی و عزیز ہے۔ کسی کی تاب نہیں ہے کہ اس کی پکڑ سے بچ سکے تو جب کوئی اس کی گرفت سے باہر ہے اور نہ باہر ہو سکتا تو وہ جلدی کیوں کرے! جلدی کی ضرورت اسے پیش آتی ہے جس کو اندیشہ ہو کہ شکار اس کے قابو سے باہر نکل جائے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (۲۰)

یہ اسی سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رزق و فضل سے انہی کو نوازے جو اس کی بندگی کرنے والے ہوں بلکہ نیکوکاروں اور بدکاروں دونوں کو وہ روزی دیتا ہے

البتہ جو لوگ آخرت کی کھیتی کرتے ہیں اللہ ان کی آخرت کی کھیتی میں بھی برکت دیتا ہے اور اس دنیا کے رزق و فضل میں سے بھی جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں، آخرت کی پروا انھیں نہیں ہوتی تو اللہ ان کو بھی اتنا دے دیتا ہے جتنا اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

'نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ' کے بعد 'نُؤْتِهٖ مِنَ الدُّنْيَا' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں۔ تقابل اس حذف پر دلیل ہے اس لیے کہ دوسرے ٹکڑے میں 'نُؤْتِهٖ مِنْهَا' کے الفاظ موجود ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۸-۲۰)

جو دنیا ہی کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کو اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جو چاہتے ہیں اور جن کے لیے چاہتے ہیں۔ پھر ہم نے ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے اور جو آخرت کے طالب ہوتے ہیں اور اس کے شایانِ شان جدوجہد کرتے ہیں اور وہ مومن بھی ہیں تو دراصل وہ ہیں جن کی سعی مشکور و مقبول ہوگی۔ تیرے رب کی بخشش سے ہم اُن کی بھی مدد کرتے ہیں اور ان کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کا دروازہ کسی پر بھی بند نہیں ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون —— آیات: ۲۱-۳۶

اوپر کے پیرے میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دینِ توحید کی تعلیم دی ہے جس کی تعلیم یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دے رہے ہیں۔ اب آگے یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ان مشرکین کے مزعومہ شرکاء نے ان کے لیے کوئی الگ دین ایجاد کیا ہے تو یہ دین خدا کے ہاں کام آنے والا نہیں ہے۔ جزائے اعمال کے دن یہ لوگ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ اس دن کی کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوگی جو ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کر کے اس دن کے لیے کچھ کمائی کر لیں گے۔

اس کے بعد مخالفین کے تین اعتراضوں کے علی الترتیب جواب دیے ہیں۔

ایک اس اعتراض کا کہ اس جوش و گرمی کے ساتھ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جو دعوت دے رہے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ہماری بہبود ان کو عزیز ہے بلکہ اس میں سراسر ان کی اپنی غرض پوشیدہ ہے۔

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمۂ آیات ۲۱-۳۶

کیا ان کے کچھ شریک خدا ہیں جنھوں نے ان کے لیے وہ دین ٹھہرایا ہے جس کا اذن اللہ نے نہیں دیا؛ اور اگر فیصلہ کی مدت طے نہ پا چکی ہوتی تو ان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور بے شک ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ تم ظالموں کو اس دن دیکھو گے کہ وہ اپنی کمائی کے وبال سے لرزاں ہوں گے اور وہ ان پر پڑ کے رہے گا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ بہشتوں کے باغیچوں میں ہوں گے۔

ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ سب سے بڑا فضل درحقیقت یہی ہے۔ یہ چیز ہے جس کی بشارت اللہ اپنے ان بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔ کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب تو ہوں نہیں بس قرابت کا حق ہے جو ادا کر رہا ہوں اور جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو ہم اس کے لیے اس میں بھلائی کی افزونی کریں گے۔ بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑی قدر افزائی کرنے والا ہے۔ ۲۱-۲۳

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے! تو اللہ اگر چاہے تو تمھارے دل پر بند لگا دے اور اللہ اپنے کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹاتا اور حق کو مستحکم کرتا ہے۔ بے شک وہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۲۴-۲۵

اور قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور وہ ان کو اپنے فضل میں سے مزید عطا فرمائے گا۔ رہے یہ کافر تو ان کے لیے ایک سخت عذاب ہے۔ ۲۶

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو کھول دیتا تو وہ زمین میں اودھم مچا دیتے بلکہ وہ ایک اندازے کے ساتھ اتارتا ہے جو چاہتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے باخبر اور ان کو دیکھنے والا ہے اور وہی ہے جو اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی حقیقی کارساز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۷-۲۸

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کیا جانا اور جو اس نے ان کے درمیان جانور پھیلائے ہیں۔ اور وہ ان کے جمع کرنے پر بھی، جب وہ ان کو جمع کرنا چاہے گا قادر ہے۔ ۲۹

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تمھاری کرتوتوں ہی کی بدولت پہنچتی ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے اور تم نہ زمین میں خدا کے قابو سے نکل سکتے (اور نہ آسمان میں) اور اللہ کے مقابل میں تمھارا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔ ۳۰-۳۱

اور اسی کی نشانیوں میں سے ہیں سمندروں میں چلنے والے، پہاڑوں کے مانند، جہاز اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے پس وہ سمندر کی سطح پر ٹھہرے ہی رہ جائیں۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے۔ یا ان کو تباہ کر دے ان کے اعمال کی پاداش میں اور بہتوں سے درگزر فرمائے اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات میں کٹ حجتی کر رہے ہیں کہ ان کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۳۲-۳۵

پس جو کچھ بھی تمھیں ملا ہے وہ دنیوی زندگی کی متاع حقیر ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر اور پائدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ۳۶

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۱)

'اَمْ' یہاں استنکار و استعجاب کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کا دین، جو اس نے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بھیجا، وہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا تو یہ نیا دین کہاں سے آدھمکا! کیا

یہ دین شرک کہاں سے آنکلا!

ان کے کچھ شرکاء ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایک ایسا دین گھڑ دیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ یعنی اللہ کی منظوری کے بدون تو کوئی دین اللہ کا دین نہیں ہو سکتا تو یہ دین کہاں سے آیا؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں تو اللہ کا تو کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ محض ان کا وہم ہے۔

'وَلَوۡلَا کَلِمَۃُ الۡفَصۡلِ لَقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ'۔ یہ مضمون اوپر آیت ۱۴ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ ان کو دھمکی ہے کہ اگر اللہ نے ان کے فیصلے کے لیے ایک وقت نہ مقرر کر لیا ہوتا تو ان کا قصہ اسی دنیا میں ابھی پاک کر دیا جاتا۔ پس ان کو جو مہلت ملی ہوئی ہے اس سے مغرور نہ ہوں بلکہ اللہ کے شکرگزار رہوں کہ وہ ان کے پکڑنے میں جلدی نہیں کر رہا ہے۔ اگر انھوں نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو یاد رکھیں کہ اس طرح کے ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ 'ظالمین' سے مراد یہاں یہی مشرکین ہیں جنھوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو چھوڑ کر ایک نیا دینِ شرک ایجاد کیا اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔

تَرَی الظّٰلِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا وَ ہُوَ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیۡ رَوۡضٰتِ الۡجَنّٰتِ ۚ لَہُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ (۲۲)

آخرت میں آدمی کو اپنے اعمال سے سابقہ پیش آئے گا

یعنی آج تو یہ مشرکین اپنے مزعومہ شرکاء کے بل پر آخرت سے بے فکر بیٹھے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اگر آخرت ہوئی تو ان کے شرکاء ان کی مدد کریں گے، انھیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب قیامت آجائے گی اور یہ دیکھیں گے کہ یہاں کوئی کسی کا شریک و شفیع نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا واسطہ اس کے اعمال سے پڑنے والا ہے تو وہ اپنے اعمال کے وبال سے لرزاں ہوں گے لیکن ان کا یہ لرزاں و ترساں ہونا بالکل بے سود ہوگا۔ ان کے اعمال کا وبال لازماً ان کے سر پر پڑے گا اور کسی تدبیر سے بھی وہ اس کو دفع نہ کر سکیں گے۔

'وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ......' البتہ جنھوں نے دیویوں دیوتاؤں پر اعتماد کرنے کے بجائے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی وہ جنتوں کے باغیچوں میں براجمان ہوں گے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے۔

'رَوۡضٰتُ الۡجَنّٰتِ' میں 'رَوۡضٰت' سے مراد وہ ضمنی باغیچے اور لان ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وسیع جنت میں اہل جنت کی تفریح اور سیر کے لیے بنے ہوں گے۔ 'روضات' بھی ایک سے زیادہ ہوں گے اور جنتیں بھی ایک سے زیادہ ہوں گی اس وجہ سے دونوں جمع کی صورت میں آئے ہیں۔

'ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ'۔ اس ٹکڑے کا صحیح زور سمجھنے کے لیے اوپر آیت ۲۰ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ وہاں فرمایا ہے کہ اس دنیا کے طالب اپنی خزف ریزوں کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں جو ان کے آگے ڈال دیے گئے ہیں حالانکہ اصلی فضل، جس کا لوگوں کو طالب ہونا چاہیے، یہ ہے جو اللہ قیامت کے دن اپنے باایمان

بندوں پر فرمائے گا۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳)

یہ اس فضلِ عظیم کی عظمت واضح فرمائی ہے کہ اللہ اپنے باایمان بندوں کو ایک ابدی بادشاہی کی بشارت دے رہا ہے تو وہ اس کے لیے جد و جہد کریں اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑیں جو اسی دنیا کے خزف ریزوں پر ریجھے ہوئے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔ یہاں استثنار میرے نزدیک منقطع اور 'قُرْبٰی' مصدر کے مفہوم میں ہے جس طرح 'زُلْفٰی' اور 'بُشْرٰی' وغیرہ اس وزن کے دوسرے الفاظ ہیں۔

قریش کے لیڈروں کو آگاہی

مطلب یہ ہے کہ قریش کے ان برخود غلط لیڈروں کو آگاہ کر دو کہ تمھاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود، میں اس طرح جو اپنے رات دن تمھارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔ جس کے لیے خدا کی طرف سے اس فضلِ عظیم کی بشارت ہے جس کا اوپر ذکر ہوا وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہوگا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اس وجہ سے ہیں کہ میں اس حقِ قربت و قرابت سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں جو تمھارے اور میرے مابین ہے۔ تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو اس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں اس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں اس میں سب سے پہلے تمھیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔

حضرات انبیاء کی ایک صفت

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں سے کیا اور جب تک ان سے وہ مایوس نہیں ہو گئے ہیں اس وقت تک انھوں نے دوسروں کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اسی سنت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اول اول یہ ہدایت ہوئی کہ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء ۲۶: ۲۱۴) (تم اپنے قریبی خاندان والوں کو آگاہ کرو)۔ آپ کے یہ قریبی قریش تھے جن کو پورے عرب کی دینی و سیاسی پیشوائی حاصل تھی۔ آپ نے سب سے پہلے ان کو انذار کیا اور ان کی تمام تعدّیوں کے باوجود اس وقت تک آپ اس کام میں لگے رہے جب تک انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی سے مایوس نہیں کر دیا بالآخر جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آپ کے قتل و اخراج کے مشورے ہونے لگے تب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کو ہجرت فرمائی۔

استاذ امام کا نقطۂ نظر

استاذ امامؒ اس آیت کو ذرا مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس استثناء کو استدراک کے مفہوم میں لیتے ہیں اور اس آیت کی تاویل سورۂ سبا کی آیت ۴۷: قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ

إِلَّا عَلَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمہارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے) کی روشنی میں کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ میں جو تمہیں صلۂ رحم، ادائے حقوق اور انفاق کی دعوت دیتا ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ یہ میں کوئی ذاتی غرض سامنے رکھ کر کر رہا ہوں بلکہ یہ تمہاری ہی دنیا اور آخرت کی بہبود کے لیے ہے۔ یہ مال تمہارے اغنیاء سے لے کر تمہارے ہی غرباء میں تقسیم کر دیا جائے گا اور اس طرح میں تمہیں مَوَدَّت فی القربیٰ کی راہ دکھا رہا ہوں۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اموالِ زکوٰۃ سے اپنے اور اپنے اقرباء کے لیے کسی قسم کا استفادہ جائز نہیں رکھا تھا تاکہ اس طرح کی بدگمانی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

ان دونوں تاویلوں میں زیادہ بُعد نہیں ہے اس لیے کہ انقطاع اور استدراک دونوں ایک ہی نوع کی چیز ہے۔ تاہم دونوں میں کچھ فرق ہے۔ مجھے اگرچہ اپنی تاویل پر زیادہ اطمینان ہے تاہم میں مولاناؒ کی تاویل کو غلط نہیں کہتا۔

مؤلف کا نقطۂ نظر

میرے نزدیک آیت کی صحیح تاویل یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر تو نہیں مانگتا، بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اس کی بنا پر میرے ساتھ حسنِ معاشرت کا برتاؤ رکھو۔ اس تاویل میں جو ضعف ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ حسنِ معاشرت کا سوال بھی ایک اجر ہی کا سوال ہے اور سورۂ شعراء میں تمام انبیاء ——— نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام ——— کی زبان سے بالاتفاق منقول ہے کہ "مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ" (میں تم سے اس چیز پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس خداوندِ عالم کے ذمہ ہے) کسی نبی نے بھی اپنی دعوت کے صلہ میں اپنی قوم سے اپنے ساتھ حسنِ معاشرت کی اپیل نہیں کی اس لیے کہ سارا جھگڑا تو دعوت ہی کی بنا پر تھا تو جب نبی کے لیے اس میں کوئی مداہنت برتنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی تو مخالفوں سے حسنِ معاشرت کی اپیل کرنے کے کیا معنی! قریش کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو عناد تھا وہ محض آپ کی دعوت کی بنا پر تھا۔ وہ آپ کی ہر خواہش پوری کرنے اور آپ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار تھے بشرطیکہ آپ اپنی دعوتِ توحید سے باز آجائیں لیکن آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔ اس کے بعد جب قریش کا رویّہ مزید سخت ہوا تو آپ نے ان سے حسنِ معاشرت کی درخواست کرنے کے بجائے ان کو صاف الفاظ میں آگاہ کر دیا کہ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو، مجھے اگر اُحد کے برابر بھی سونا دے دیا جائے جب بھی میں اپنی دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں۔

بعض گمراہ فرقوں نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ میں اس دعوت پر تم سے بس یہ اجر مانگتا ہوں کہ میرے اقرباء کے ساتھ محبت کرو۔ یہ تاویل آیت کے الفاظ، دوسرے نصوص اور عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن

صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جن لوگوں نے یہ تاویل کی ہے انھیں شاید یہ بات بھی یاد نہیں رہی کہ یہ آیت مکی دور کی ہے جب آپ کے خاص اقرباء میں اکثر آپ کے جانی دشمن تھے، ان کے لیے لوگوں سے محبت کی اپیل کرنے کے کیا معنی!

قریش کو ایک اور تنبیہ

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ بھی بتا دو کہ تمھاری نیکی اور پرہیزگاری سے اللہ کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تم نے اس کی بندگی نہ کی تو اس کی خدائی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے گا بلکہ اس میں سراسر تمھارا ہی نفع ہے اس لیے کہ تم جو چھوٹی بڑی نیکی بھی کرو گے اس میں اللہ افزونی اور بڑھوتری دے گا اور اس کا صلہ تم ایک ابدی بادشاہی کی شکل میں پاؤ گے۔ اللہ بڑا بخشنے والا اور لوگوں کی نیکیوں کی بڑی قدر افزائی فرمانے والا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ اس کی پرورش کر کے اس کو بڑھائے گا اور ایک اجرِ عظیم کی صورت میں اس کو اپنے بندے کو عطا فرمائے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲۴)

ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار

یعنی اگر اس میزانِ عدل (قرآن) کے خلاف انھوں نے یہ فتنہ اٹھایا ہے کہ یہ ہے تو تمھاری ایجاد لیکن محض لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے تم نے اس کو جھوٹ موٹ اللہ سے نسبت دے رکھی ہے تو تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کرتی ہے کہ نہ تم نے اپنی خواہش سے یہ چیز پائی ہے اور نہ اپنی خواہش سے اس کو پا سکتے ہو بلکہ خدا ہی نے اس چشمۂ فیض کو تمھارے اندر جاری کیا ہے اور وہ جب بھی چاہے اس کو روک سکتا ہے۔ یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں یوں گزر چکا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ	اور اگر ہم چاہیں تو اس کو سلب کر لیں جو ہم نے
بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	تمھاری طرف وحی کی ہے۔ پھر تم کسی کو ہمارے
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا	مقابل میں، اس کو واپس دلانے کے لیے وکیل نہ
وَكِيْلًا ۙ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ	پا سکو۔ یہ محض تمھارے رب کا، تمھارے اوپر
اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۔	ایک فضل ہے۔ بے شک اس کا فضل تمھارے اوپر
(بنی اسرآءیل: ۸۶-۸۷)	بہت بڑا ہے۔

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ' واو ' حالیہ ہے اور ' يَمْحُ ' کا عطف ' يَخْتِمْ ' پر نہیں ہے بلکہ یہ الگ جملہ ہے۔ یہ دراصل ' يَمْحُوْ ' ہے لیکن مصاحف کے رسم الخط میں اس طرح کی ' واو ' بعض جگہ ساقط کر دی گئی ہے، مثلاً ' يَدْعُ الْاِنْسَانُ ' یا ' سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ' وغیرہ۔

مذکورۂ حقیقت کا ایک اور پہلو

یہاں اوپر والی بات کا دوسرا پہلو ہے کہ جو لوگ اس قرآن کو افترا قرار دیتے ہیں کیا وہ اس کے

اثر کو نہیں دیکھتے کہ اللہ اپنے ان کلمات کے ذریعہ سے باطل کو مٹا اور حق کا اثبات کر رہا ہے۔ افترا ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹائے اور حق کو اجاگر کرے بلکہ اس کا کام اس کے بالکل برعکس ہے۔ ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات سیدنا مسیحؑ سے ان لوگوں کے جواب میں منقول ہوئی ہے جو آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ بدروحوں کو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے نکالتے ہیں۔ آپ نے ان معترضین کو یہ جواب دیا کہ اگر میں نے شیطانوں کو شیطان ہی کی مدد سے نکالا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ شیطان خود ہی اپنا دشمن بن گیا۔ یہی بات یہاں ارشاد ہوئی کہ اگر یہ کلام افترا اور اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے تو اس کا اثر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی صورت میں نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس نکلتا تھا۔ دنیا میں کس مفتری نے اس طرح کا فیض بخش اور ارواح و قلوب کو متوثر کرنے والا کلام پیش کیا ہے جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے!

مخالفین کو تنبیہ

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ یہ ان کو تنبیہ ہے جو قرآن کو افترا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مفتری قرار دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے یہ فتنہ اٹھایا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نہ قرآن افترا ہے اور نہ اس کا پیش کرنے والا مفتری ہے۔ ان کو قرآن کی جلالت کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی عظمت کا بھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن حق ہے اور اس کا پیش کرنے والا ایک بے داغ کردار کا انسان ہے لیکن چونکہ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اس وجہ سے اپنے دل کی آواز کے بالکل خلاف اس طرح کی باتیں گھڑتے اور پھیلاتے تھے۔ ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ خدا تمھارے دلوں کے بھیدوں سے اچھی طرح واقف ہے کہ تمھارے دلوں کے اندر کیا ہے اور زبانو سے تم کیا کہہ رہے ہو!

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ (۲۵)

توبہ اور اصلاح کی ترغیب

یہ ان لوگوں کو توبہ اور اصلاح کی ترغیب ہے کہ اب بھی موقع باقی ہے کہ تم چاہو تو توبہ و اصلاح کر کے اپنے کو خدا کے غضب سے بچا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی مہربان اور اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ جو تم کر رہے ہو اس سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ اپنا کوئی جرم بھی اس سے چھپا نہ سکو گے۔

وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۲۶)

یہ اہلِ ایمان کی روش اور ان کے انجام کو ان کے سامنے رکھا ہے کہ جس طرح انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق پائی اور اس کے صلہ میں ان پر دنیا و آخرت میں مزید افضال ہوں گے اسی طرح یہ لوگ بھی

چاہیں تو ان افضال کے سزاوار بن سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ کفار کے لیے خدا کے ہاں سخت عذاب ہے۔ 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' یہاں میرے نزدیک مفعول کے محل میں نہیں بلکہ فاعل کے محل میں ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ط وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ' (الانعام: ۳۶) (قبول تو وہی کریں گے جو بات گوشِ دل سے سنتے ہیں۔ رہے مردہ دل تو اللہ ان کو اٹھائے گا ......)۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ط اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ (۲۷)

ایک مغالطہ کی اصلاح

یعنی یہ لوگ اگر اپنی دنیا کی دولت اور ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھے بیٹھے ہیں اور اس غرے میں پیغمبر اور اس کے غریب ساتھیوں کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں تو یہ محض ان کی خود فریبی ہے۔ دنیا کی دولت و ثروت کسی کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ یہ چیز محض امتحان کے لیے ہے اور اللہ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق کافر و مومن دونوں کو یہ دیتا اور دونوں کا امتحان کرتا ہے۔ یہ چیز تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے حالات و مصالح سے اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اپنی حکمت و مصلحت کے تحت جس کے لیے چاہتا ہے اس کو تنگ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور اس طرح ان کے صبر یا شکر کا امتحان کرتا ہے۔ وہ چاہتا تو اس کے دروازے سب کے لیے نہایت کشادہ کر دیتا کہ لوگ جتنا چاہیں اس میں سے سمیٹ لیں لیکن یہ چیز ان لوگوں کے لیے بہت بڑا فتنہ بن جاتی، لوگ اس کے نشہ میں سرکشی و بغاوت کے راستہ پر چل پڑتے۔ اس فتنہ سے لوگوں کو بچانے کے لیے اللہ نے یہ معاملہ تمام تر اپنے اختیار ہی میں رکھا ہے۔ وہی اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق جتنا رزق چاہتا ہے اتارتا ہے۔ اگر کسی کو اس نے زیادہ دیا ہے تو وہ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ یہ اس کی اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ یا اس کا اور اس کے آباد و اجداد کا حق ہے بلکہ اس رب کا شکر گزار رہے جس کے اختیار میں بخشنا بھی ہے اور بخش کر چھین لینا بھی۔

یہ مضمون آگے والی سورہ ——— زخرف ——— میں جو اس کی توام سورہ ہے، اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ۝ اَهُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بستیوں ——— مکہ یا طائف ——— کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہیں اتارا گیا! کیا تیرے رب کے فضل کی تقسیم کرنے والے یہی ہیں! دنیا میں ان کی معیشت کی تقسیم ہم نے کی ہے اور ان کے درجے ایک دوسرے پر بلند کیے ہیں تاکہ ان میں سے ایک دوسرے کا تعاون حاصل کر سکے اور

دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ	تیرے رب کا فضل ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو
وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝	وہ جمع کیے ہوئے ہیں۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ
وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً	سب ایک ہی ڈگر پر چل پڑیں گے تو ہم ان لوگوں
لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ	کے گھروں کی چھتیں، جو خدائے رحمان کا کفر کرتے ہیں،
لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ	چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی، جن پر وہ چڑھتے۔
وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ	اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی
اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝	جن پر وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے، اور یہ چیزیں سونے
وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا	کی بھی بنا دیتے۔ یہ دنیوی زندگی کی چند روزہ متاع
مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ	ہے اور آخرت کی کامرانی تیرے رب کے پاس
رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۱-۳۵)	متقیوں کے لیے ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ - ۲۸

اوپر کی بات پر دلیل

یہ دلیل ہے اس بات کی جو اوپر ارشاد ہوئی ہے کہ اللہ ہی اپنے اندازے کے مطابق بندوں کے لیے رزق اتارتا ہے، نہ بندوں کو اس معاملے میں کچھ اختیار رہے نہ ان کے مزعومہ شرکا کو۔ فرمایا کہ اللہ ہی اتارتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ بالکل مایوس ہو جاتے ہیں۔ بارش کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ معاش کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ اور مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ان تمام لوگوں کو جن کو اپنی تدبیر، اپنے استحقاق، اپنے وسائل و ذرائع اور اپنے شرکا و شفعاء پر ناز ہے، اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ آسمان کے بند دریچوں کو کھولنا اس کے خالق کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی یہ شان اسی لیے وقتاً فوقتاً دکھاتا رہتا ہے کہ کوئی اس غرّے میں نہ مبتلا ہو کہ رزق و فضل کسی کی میراث ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور اس کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ۔ یہ خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آئے دن کا یہ مشاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ کارسازِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ حمید، یعنی ستودہ صفات اور تمام سزاوارِ حمد و شکر کا منبع ہے۔ اس حیاتِ چند روزہ میں وہ ان لوگوں کو بھی اپنے رزق سے محروم نہیں کرتا جو اسی کے رزق پر پلتے اور اسی کو چیلنج کرتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (۲۹)

یعنی کسی کو یہ مغالطہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو عذاب وقیامت سے جو ڈرایا جا رہا ہے یہ محض دھمکی ہے۔ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ لوگوں کو دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے۔ یہ وہی دلیل ہے جو دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہوئی ہے: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (النّٰزعٰت: ۲۷) (کیا تمھارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے، یا اس آسمان کا جس کو بلند کیا)۔

ایک اور مغالطہ کی اصلاح

لفظ 'دَآبَّۃٌ' زمین کی جاندار چیزوں کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا آسمانوں میں بھی اس طرح کی کوئی مخلوق پائی جاتی ہے جس پر 'دَآبَّۃٌ' کا اطلاق ہو سکے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو یہاں 'وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّۃٍ' میں مثنیٰ کی ضمیر کیوں استعمال ہوئی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ لفظ 'سماء' جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح اس فضا کے لیے بھی آتا ہے جس میں پرندے پرواز کرتے ہیں۔

اس آیت میں 'بَثَّ' اور 'جمع' کا تقابل بھی نہایت بلیغ اور قیامت کی ایک نہایت دلنشین دلیل ہے 'بثّ' کے معنی چھینٹنے، بکھیرنے اور پھیلانے کے ہیں اور 'جمع' کے معنی اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ جس نے زمین اور فضا میں یہ تمام جاندار پھیلائے ہیں وہ ان کو جب چاہے گا جمع کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب وہ بکھیرنے پر قادر ہوا تو ان کو سمیٹنے سے کیوں قاصر رہے گا۔ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے وہ ضائع کرنے کے لیے تخم نہیں بکھیرتا بلکہ وہ اس کا حاصل ایک دن جمع بھی کرتا ہے اور اس میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ۝ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۳۰-۳۱)

شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے

یہ اسی اوپر والے شبہ کا ازالہ ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ خدا کے قانونِ مجازات کا تجربہ تو تم اپنی روزمرہ زندگی میں بھی کر سکتے ہو۔ اس دنیا میں تمھیں جو دکھ بھی پہنچتے ہیں وہ تمھارے اعمال ہی کے نتیجے میں پہنچتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تمھاری بہت سی بداعمالیوں سے درگزر بھی فرماتا ہے۔ یہ دکھ جو تمھیں پہنچتے ہیں تمھاری تنبیہ و تذکیر کے لیے پہنچتے ہیں تاکہ تم اس دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر اس میں لاأبالیانہ زندگی نہ گزارو بلکہ ان تنبیہی واقعات سے یہ سبق حاصل کرو کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اور وہ ایک دن تم کو جمع کر کے تم سے ضرور مواخذہ فرمائے گا۔ اگر آج وہ تمھیں ڈھیل دے رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو تمھارے خیر و شر سے کوئی تعلق نہیں یا تمھارے شر ہی کو اس نے خیر کا درجہ دے دیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کامل جزا و سزا کے لیے ایک خاص یوم الفصل مقرر کر رکھا ہے جو لازماً آ کے رہے گا۔

'یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ' میں لفظ 'عفو' درگزر کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال جگہ جگہ ہوا ہے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ۔ یعنی یہ بھی تم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنی کوئی آفت زمین میں نازل کرتا ہے تو تم اس کے قابو سے باہر نہیں نکل پاتے اور نہ تمہارا کوئی کارساز و مددگار تمہاری بگڑی بناتے یا تمہاری حمایت و مدافعت کے لیے اٹھتا ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسی طرح آسمان میں بھی قیامت کے دن، تم کو خدا کی پکڑ سے نہ کوئی شریک و شفیع بچا سکے گا اور نہ کوئی حامی و مددگار۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ خطاب کفار سے ہے جن کو اس دنیا میں جو تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں ان کے اعمال کی پاداش ہی میں پہنچتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا خالق جزا اور سزا دینے والا ہے اس وجہ سے وہ ایک ایسا روزِ جزا ضرور لائے گا جس میں ان کے ان جرائم کی بھی وہ سزا دے گا جن سے اس دنیا میں وہ درگزر کر رہا ہے۔ اس آیت کا تعلق انبیاء اور صدیقین و صالحین سے نہیں ہے۔ ان کو جو مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر نہیں بلکہ ابتلاء کے طور پر پیش آتے ہیں، جن سے مقصود ان کے صبر کا امتحان ہوتا ہے اور یہ امتحان ان کے مدارج کی بلندی کا ذریعہ بنتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ۚ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۙ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ۙ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ (۳۲-۳۵)

دنیا کی کامیابی پر مغروروں کے لیے ایک تمثیل

یہ ان لوگوں کے سامنے ایک مثال پیش کی ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں پر مگن ہیں کہ اس دنیا کی زندگی کو کشتی کے سفر کی مانند سمجھو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کے مانند بھاری بھاری جہازات سمندر کے سینہ پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ جن لوگوں کی نظر خدا کی قدرت پر نہیں ہوتی وہ جب جہاز کو رواں دواں دیکھتے ہیں تو مگن ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کو کوئی خطرہ بھلا کہاں سے اور کس طرح پیش آسکتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو روک دے اور یہ جہازات اپنے مسافروں سمیت سطح سمندر پر ہی پڑے رہ جائیں یا ان کو ان کے مسافروں سمیت ان کی جگہ ہی پر غرق کر دے اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بنے۔ اس تمثیل میں اگرچہ پیش نظر بادبانی جہازات ہیں اس لیے کہ اس وقت تک بادبانی جہازات ہی وجود میں آئے تھے لیکن ٹھیک یہی تمثیل آج کے ترقی یافتہ جہازوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ آج سائنس کی ترقیوں نے انسان کو اسٹیم، بجلی اور ایٹم کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے جس سے اس کی طاقت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے لیکن آج بھی ہم آئے دن بڑے بڑے بحری جہازوں کے متعلق اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ بتاشہ کی طرح پانی میں بیٹھ جاتے ہیں، یا ان کی ساری مشینری اس طرح معطل ہو جاتی ہے کہ ایک لاشہ لیے جان کی طرح ان کو دوسرے جہازات گھسیٹ کر ساحل پر پہنچاتے ہیں۔

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ' یہ اس سبق کی طرف اشارہ ہے جو اس تمثیل میں مضمر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرتیں پوشیدہ ہیں جو صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ زندگی کے حالات و واقعات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ناسازگار حالات پیش آئیں تو اس کو مایوس و دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے رب کے بھروسے پر صبر کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے خدا کے حکم ہی سے پیش آتا ہے اور خدا کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی کو سازگار حالات میسر آئیں تو اس کو اترانے اور فخر کرنے والا نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے رب کا برابر شکر گزار رہنا چاہیے اس لیے کہ بندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں ان کو نعمت مغرور اور مصیبت مایوس بناتی ہے وہ کبھی ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوتے۔ آگے اسی سورہ میں اسی طرح کے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَۃً فَرِحَ بِھَا ج وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْھِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ' (۴۸) (اور جب ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں تو وہ اس پر اتراتا ہے اور اگر اس کو اس کے اعمال کی پاداش میں کوئی مصیبت پہنچ جائے تو ناشکرا بن جاتا ہے)۔

'اَوْ یُوْبِقْھُنَّ بِمَا کَسَبُوْا وَیَعْفُ عَنْ کَثِیْرٍ' اس کا عطف اوپر والے جملے 'اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ الرِّیْحَ' پر ہے۔ 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ ... الاٰیۃ' والا فقرہ بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، اس تمثیل کے مقصد کی طرف توجہ دلانے کے لیے آگیا ہے۔ جملہ معترضہ کے بعد بات پوری کر دی گئی کہ جس طرح وہ قادر ہے کہ ہوا کو روک کر جہازوں کو سطح سمندر ہی پر ساکن کر دے اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ان کو ان کے مسافروں کے اعمال کی پاداش میں غرق کر دے اور چاہے تو ان میں سے بہتوں کے گناہوں سے درگزر فرمائے اور وہ بھنور سے نکل کر بخیریت ساحل پر پہنچ جائیں۔ ان تینوں میں سے ہر بات اس کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اس دنیا میں کسی کے لیے اپنی کسی کامیابی پر مغرور ہونا جائز نہیں ہے بلکہ کامیابی حاصل ہو تو اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اور کوئی افتاد پیش آئے تو اس کو اپنی کسی کوتاہی کا نتیجہ سمجھ کر صبر کرنا چاہیے اور اللہ سے خیر کی امید رکھنی چاہیے۔

حذف کی ایک مثال

'وَیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا ط مَا لَھُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ' یہاں 'یَعْلَمَ' حالت نصب میں ہے اس وجہ سے اس کا معطوف علیہ محذوف ماننا پڑے گا۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آرہی ہیں۔ مثلاً 'وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ' (الجاثیۃ: ۲۲) (اور آسمانوں اور زمین کو اس نے غایت کے ساتھ پیدا کیا (تاکہ وہ ایک روز عدل لائے)

اور تاکہ ہر جان کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے) اسی اصول پر یہاں کوئی مناسب تعلیل محذوف ماننی پڑے گی۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ تاکہ اللہ ان سے انتقام لے اور تاکہ آیاتِ الٰہی میں کٹ حجتی کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کے لیے خدا سے بھاگ سکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ مضمون قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے آیا ہے۔ ہم ایک نظیر سورۂ یونس سے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (یونس: ۲۲-۲۳)

وہی ہے جو تم کو سفر کراتا ہے خشکی اور تری میں۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ سازگار ہواؤں سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں، آپڑتی ہے ان پر بادِ تند اور اٹھنے لگتی ہیں ان پر موجیں ہر جانب سے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے۔ اس وقت وہ اللہ کو پکارتے ہیں، اسی کی خالص اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس ورطۂ ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن کے رہیں گے۔ پس جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ پھر زمین میں بلا کسی حق کے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی کا وبال تمھارے ہی اوپر پڑنے والا ہے۔ اس دنیا کی چند روزہ متاع سے فائدہ اٹھا لو۔ پھر ہم تم کو بتائیں گے جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

فَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۳۶)

خلاصۂ بحث

یہ آخر میں اوپر والی بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ دنیا کی جو نعمتیں تمھیں ملی ہیں، اترانے اور فخر کرنے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اس حیاتِ چند روزہ کی متاع ہیں۔ ایک دن بالآخر یہ زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور اس کا یہ سروسامان بھی۔ البتہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کہیں بہتر اور ابدی ہے جو ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس کے چاہنے والے بنو۔ اس دنیا کی متاعِ حقیر کے پیچھے کیوں اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔

یہاں وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں ان کے لیے اس راہ میں اصلی زادِ راہ توکل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں ان کو خدا کے بھروسہ اور آخرت کے صلہ کے اعتماد پر طلاق دے سکے اس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات: ۳۷-۴۳

آگے کی آیات میں مذکورہ بالا اجر کے مستحقین کی کچھ اور صفتیں بیان فرمائی ہیں جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان اس دور میں قریش کے مغروروں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کے مظالم سے تنگ آکر اپنے گھر در چھوڑنے پر مجبور ہو رہے تھے، وہی اس کے اصلی حق دار ہیں۔ یہ سورہ، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، ہجرت کے بالکل قریب نازل ہوئی ہے اس وجہ سے ان صفات کے بیان کا انداز کچھ اس طرح کا ہے جس میں مسلمانوں کے لیے فتح باب کی بشارت بھی ہے اور آگے کے مراحل میں ان کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق بعض ضروری ہدایات بھی۔ گویا ہجرت سے پہلے ہی ان کو یہ بتا دیا گیا کہ اب تک وہ منتشر افراد کی صورت میں تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ ان کو ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی میں منظم کرنے کی شکل پیدا کر رہا ہے۔ اب تک وہ مظلوم تھے لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ وہ اپنی مدافعت کی قوت بھی حاصل کریں گے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے مجاز بھی ہوں گے ——— ان پیش آنے والے حالات میں ان کو کیا رویہ اختیار کرنا ہے اس کی طرف ان آیتوں میں رہنمائی کی گئی ہے لیکن اس رہنمائی کا انداز امر و حکم کا نہیں بلکہ ایمان اور توکل کے لازمی مقتضیات کے بیان کا ہے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۷-۴۳

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

ع ۴ / ۱۴ / ۵

ترجمہ آیات ۳۷-۴۳

اور وہ بچتے ہیں بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے اور جب غصّہ ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور وہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبّیک کہی اور نماز کا اہتمام کیا اور ان کا نظام شورٰی پر ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ۳۷-۳۸

اور وہ کہ جو انتقام لیتے ہیں اس وقت جب ان پر تعدّی ہوتی ہے اور کسی برائی کا بدلہ اس کے برابر کے عمل سے ہے۔ پس جس نے درگزر کی اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جنھوں نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیا تو ان کے اوپر کوئی الزام نہیں۔ الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۳۹-۴۲

اور جس نے صبر کیا اور معاف کیا تو بے شک یہ عزیمت کے اوصاف میں سے ہے۔ ۴۳

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۳۷)

برائیوں کے تین عنوان

یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جو خدا کی نعمتیں پاکر ظلم، بے حیائی اور بغی و طغیان میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ حق تلفی، بے حیائی اور غصہ و انتقام کی قسم کے تمام بڑے جرائم سے اجتناب کرنے والے ہیں۔ اس اسلوب بیان میں مخالف گروہ پر جو تعریض ہے وہ وضاحت کی محتاج نہیں ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تمام برائیوں کو تین عنوانوں کے تحت سمیٹ دیا گیا ہے: اثم، فحشاء اور غضب — اثم سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی، ناانصافی اور ظلم کی نوعیت کی ہوں۔ فحشاء سے وہ برائیاں مراد ہیں جو شہوات اور خواہشات نفس کی راہ سے ابھری ہیں۔ غضب، انانیت، خودسری اور استکبار سے وجود میں آتا ہے اور طغیان و فساد اور بغی و جبر کو جنم دیتا ہے۔

یہاں ان برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان خیر و شر کے دو متضاد داعیات کی کشمکش کے اندر امتحان میں ڈالا گیا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ اس سے یہ نہیں ہے کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ اگر یہ بوجھ اس پر ڈالا جاتا تو یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چاہا ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی چھوٹی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔

دوسری یہ کہ چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے اس کا ضمیر اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے خائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اس طرح کی کوئی حرکت اس سے صادر ہوگی بھی تو سہواً ہی ہوگی، عمداً نہیں ہوگی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں ان کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔

'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ جہاں تک غصہ کے آنے کا تعلق ہے وہ تو ان کو آتا ہے اس لیے کہ غصہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس غصہ سے بے قابو ہو کر اپنی عقل سے دست بردار اور خدا کے حدود سے متجاوز ہو جائیں بلکہ وہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں جن کی حرکتیں اگرچہ غصہ دلانے والی ہوتی ہیں لیکن مختلف وجوہ سے وہ مستحق ہوتے ہیں کہ ان سے درگزر کی جائے۔ اس میں درپردہ مسلمانوں کو اس بات کی تلقین بھی ہے کہ ہر چند تمھارے دشمنوں کا رویہ نہایت اشتعال انگیز ہے لیکن ابھی یہی بہتر ہے کہ ان سے درگزر کرو۔

یہاں تک کہ ان پر اللہ کی حجت تمام ہو جائے۔ آگے کی آیات میں اس کی وضاحت آ رہی ہے۔ یہاں ضمیر 'ھُم' کے اظہار سے جملہ میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ اگرچہ یہ کام ہے نہایت کٹھن لیکن مستحقِ آفرین ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ص وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳۸)

وہ صفات جن سے مذکورہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں

یہ ان صفات کا بیان ہے جن سے ان کے اندر وہ خوبیاں پیدا ہوئی ہیں جن کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ انھوں نے اپنے رب کی اس دعوت پر لبیک کہی ہے جو اس کے رسول کے واسطہ سے ان کو پہنچی ہے۔ قریش کے متکبرین کی طرح انھوں نے اس کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی اسی خوبی کی طرف اوپر آیت ۲۶ میں اشارہ فرمایا ہے: 'وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُہُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ' (اور اس کو قبول کر رہے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ ان کے لیے اپنے فضل میں افزونی فرمائے گا)۔

ایمان کا اولین مظہر نماز ہے

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ'۔ یہ اس قبول کرنے یا بالفاظِ دیگر ان کے ایمان کے اوّلین مظہر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ دین کی اس حقیقت کا اظہار اس کتاب میں ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ ایمان کا سب سے پہلا عملی مظہر نماز ہے۔ یہی اس کا اوّلین مظہر بھی ہے اور پھر اسی سے دوسری نیکیاں ظہور میں بھی آتی اور اسی سے پروان بھی چڑھتی ہیں۔ اس وجہ سے جس نے نماز کا اہتمام نہیں کیا اس نے گویا ایمان کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔ اگر وہ ایمان کا مدعی ہے تو اس کا یہ دعویٰ محض خود فریبی ہے۔

یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ 'اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ یعنی وہ نماز پڑھتے بھی ہیں اور یہ اہتمام بھی کرتے ہیں کہ دوسرے بھی نماز پڑھیں۔ یہی نماز اور اہتمامِ نماز ان کی جماعتی زندگی کی خصوصیت اور اس دنیا میں ان کا اصلی امتیاز ہے۔ یہی نماز ان کو سکھاتی ہے کہ ان کو دنیا میں اپنے رب کی بندگی اور اس کے دین کی اقامت کے لیے کس طرح بنیانِ مرصوص بن کر زندگی گزارنی ہے اور یہی نماز اس فحشاء اور منکر سے ان کو روکتی ہے جن سے اجتناب کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ نماز کی اس حقیقت کی طرف دوسرے مقام میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے: 'اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ' (نماز بے حیائی اور ناروا باتوں سے روکتی ہے) —— اس میں بھی قریش کے لیڈروں پر تعریض ہے کہ نماز تو انھوں نے برباد کر دی لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے اس گھر کے وارث ہونے کے مدعی ہیں جو نماز اور اہتمامِ نماز کے ایک مرکز کی حیثیت سے تعمیر ہوا تھا۔

اسلامی نظام کی بنیاد شوریٰ پر ہے

'وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ' —— 'شُوْرٰی' مصدر ہے 'فُتْیَا' کے وزن پر اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے

کے ہیں۔ لفظ 'امر' عربی میں ہمارے لفظ 'معاملہ' کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل اور سیاق و سباق سے کرتے ہیں۔ یہاں قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی نظم کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا جماعتی اور سیاسی نظم خود سری، انانیت، خاندانی برتری، نسبی غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔ اس میں قریش کے نظم سیاسی و اجتماعی پر جو تعریض ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے اس لیے کہ ان کا نظمِ اجتماعی تمام تر خاندانی اور نسبی امتیاز پر قائم تھا۔ اسلام کی مخالفت کا ایک بڑا سبب ان کے لیے یہ بھی تھا کہ وہ اس دعوت کے فروغ پانے کی صورت میں اپنے اس جاہلی نظام کی موت سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں ایک طرف تو مسلمانوں کو یہ بشارت دے دی کہ ان کے لیے ایک ہیئتِ اجتماعی و سیاسی کی شکل میں منظم ہونے کا وقت آگیا اور یہ نظمِ اجتماعی نسب اور خاندان کی اساس کے بجائے اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہوگا، دوسری طرف در پردہ قریش کے لیڈروں کو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اب تم خواہ کتنا ہی زور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت میں صرف کرو لیکن انہی کمزور و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں وہ نیا نظام آرہا ہے جو تمہارے اس فاسد نظام کی بساط الٹ کر رکھ دے گا۔

شوریٰ کی اہمیت کا ایک خاص پہلو

یہاں شورائی نظام کی خصوصیات اور اس کے اصول و مبادی پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اپنی کتاب — اسلامی ریاست — کی ایک مستقل فصل میں کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ البتہ ایک سوال یہاں قابلِ غور ہے کہ قرآن کا معروف اسلوبِ بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں 'شوریٰ' کا ذکر آگیا ہے۔ آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

اسلام کا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کیا گیا

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظمِ اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم و تقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدودِ الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون و چرا اطاعت کرنی ہے، اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابقِ شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظمِ اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا

کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحبِ علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون و چرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومتہ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔

نماز اور ہمارے سیاسی نظام کا یہ تعلق ہے جس کے سبب سے قرآن نے ٹھیک اس وقت جب مسلمان ایک ہیئتِ اجتماعی کی شکل اختیار کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی شوریٰ کی طرف فرمائی اور اس شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کر کے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرما دی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہو گی، کس طرح کے لوگ اس کی رکنیت کے لیے موزوں ہوں گے، جماعت اور خلقِ خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسئولیت کس کے آگے ہو گی۔

شوریٰ کی اہمیت اور نماز کے ساتھ اس کے تعلق کا یہی پہلو تھا کہ عہدِ رسالت اور خلفائے راشدین کے دور میں اس کا انعقاد مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ خلیفۂ ثانی حضرتِ عمر فاروقؓ کے متعلق تو سیرت کی کتابوں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ شوریٰ کے انعقاد کا اعلان 'الصلوٰۃ جامعۃ' کے الفاظ سے کراتے تھے۔ یعنی اہلِ شوریٰ نماز کے لیے جمع ہوں۔ جب اہلِ شوریٰ مسجد میں جمع ہو جاتے تو وہ دو رکعت نماز ادا کرتے۔ ظاہر ہے کہ جب، وہ نماز پڑھتے تھے تو دوسرے اہلِ شوریٰ بھی ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔ نماز اور دعا کے بعد حضرت عمرؓ مسئلہ زیرِ بحث پیش کرتے اور اہلِ شوریٰ اس پر اپنی رایوں کا اظہار کرتے اور خلیفہ کی رہنمائی میں کسی متفق علیہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے حصول کے پہلو سے بھی نہایت بابرکت ہے اور اسلام کے نظمِ سیاسی کی اصل روح کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں شورائی نظام کی جگہ نظام بھی دوسرے اختیار کر لیے اور مسجدوں سے بھی ان کا تعلق بالکل منقطع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو گئے اور ان کی باگ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب پارلیمنٹوں کے ایوانوں میں جو دھینگا مشتی ہوتی ہے اس کی مثال بازاروں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

'وَمِمَّا رَزَقْنٰہُمْ یُنْفِقُوْنَ': نماز کے ساتھ انفاق یا زکوٰۃ کے تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ مفصل بحث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ایک ستون تو یہ ہے کہ اس کی نماز پڑھی جائے

اور اس کا دوسرا ستون یہ ہے کہ اس کے بخشے ہوئے رزق میں سے اس کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ پہلی چیز بندے کا تعلق اس کے خالق سے استوار کرتی ہے۔ دوسری چیز خلق سے اس کو جوڑتی ہے۔ اور انہی دونوں اساسات پر تمام شریعت قائم ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۳۹)

اوپر آیت ۳۷ میں یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ 'وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ'۔ یہ اسی پر ایک قسم کا استدراک ہے کہ اول تو وہ مخالفوں کی غصہ دلانے والی باتوں سے درگزر کرتے ہیں اور اگر کوئی جوابی کارروائی کرتے بھی ہیں تو اُس وقت جب ان پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی تعدّی کے دفاع اور اس کے انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے اور اس حق سے وہ بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر بات کو کسی اقدام کا بہانہ بنا لیں بلکہ وہ بدلہ لیتے ہیں تو کسی 'بغی' کا لیتے ہیں۔ 'بغی' مخالف کی کسی کھلی ہوئی تعدی، سرکشی اور زیادتی کو کہتے ہیں۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (۴۰)

انتقام میں توازن

پھر یہ کہ بدلہ لیتے بھی ہیں تو یہ نہیں کرتے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کریں۔ بلکہ وہ اس معاملے میں بھی پورا توازن قائم رکھتے ہیں۔ جواب میں صرف اتنی ہی کارروائی کرتے ہیں جو برائی کے ہم وزن ہو۔

کوئی انتقامی کارروائی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ قصاص ہے لیکن یہاں اس کو 'سَيِّئَةٌ' کے لفظ سے عربی زبان کے اس اسلوب کے مطابق تعبیر کیا گیا ہے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے کہ بعض اوقات الفاظ مجانست کے اصول پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً 'دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا'۔ ظاہر ہے کہ اس میں 'كَمَا دَانُوْا' بالکل 'كَمَا فَعَلُوْا' کے معنی میں ہے لیکن محض ہم آہنگی کے پہلو سے 'كَمَا فَعَلُوْا' کی جگہ 'كَمَا دَانُوْا' استعمال ہوا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی کے خلاف انتقامی کارروائی میں بھی کسی ایسے فعل کا ارتکاب جائز نہیں ہے جو شریعت میں بہر شکل ممنوع ہے۔

انفرادی معاملات میں پسندیدہ روش اصلاح کی ہے

'فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ'۔ یعنی ہر چند اس بات کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ اس پر تعدی کی گئی ہے تو وہ تعدی کے بقدر انتقام لے لے لیکن اس سے اعلیٰ رویہ ان لوگوں کا ہے جو درگزر کریں اور معاملہ کو اصلاح کی راہ سے طے کرنے کی کوشش کریں۔ اصلاح کی راہ اختیار کرنے میں اگرچہ جذبات کی قربانی کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا اجر بہت بڑا ہے جس کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام انفرادی واقعات میں زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو اصلاح ہی

کا طریقہ ہے، خواہ دونوں فریق خود باہمدگر اصلاح و تلافی کی کوشش کریں یا دوسروں کو اس کا ذریعہ بنائیں یا دوسرے از خود بیچ میں پڑ کر مصالحت کرا دیں۔

انتقام صرف بقدرِ تعدی جائز ہے

'إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ' یہ ایک جامع تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی پر تعدی کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض اور اگر کوئی کسی کی تعدی کا جواب اس سے بڑھ کر تعدی سے دینے کی کوشش کرے تو وہ بھی مبغوض۔ پسندیدہ روش اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ تعدی کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اگر یہ نہیں تو بقدرِ تعدی اس کا انتقام لے لیا جائے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ ۝ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۱-۴۲)

'بَعْدَ ظُلْمِهِ' میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے جس طرح سورۂ روم کی آیت 'وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ' (۳) میں ہے۔

ان لوگوں کے شبہ کا جواب جو انتقام کو دینداری کے خلاف سمجھتے ہیں

یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے۔ اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

'بِغَيْرِ الْحَقِّ' یعنی زمین کا خالق اور مالک تو خدا ہے، ان کا کوئی دخل نہ اس کی تخلیق میں ہے نہ تدبیر میں؛ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے کہ کوئی ان کے آگے سر اٹھا کے نہ چلے۔ فرمایا کہ اصل مجرم یہ لوگ ہیں اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اگر ان کے جواب میں مظلوموں کو بھی کوئی اقدام کرنا پڑے تو اس کی مسئولیت ان مظلوموں پر نہیں بلکہ ان ظالموں ہی پر ہے جنھوں نے اس کی طرح ڈالی۔ سورۂ مائدہ کی آیت 'إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوٓءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ' (۲۹) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۴۳)

خلاصۂ بحث

یہ آیت یہاں خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اگرچہ تعدی کے بقدر انتقام کا حق ہر شخص کو حاصل ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اولیٰ یہی ہے کہ لوگ صبر اور درگزر سے کام لیں۔

دوسری یہ کہ یہ درگزر صرف وہی لوگ کر سکیں گے جن کے اندر صبر کی خصلت ہو گی۔ جن کے اندر یہ صفت نہیں ہے وہ یہ بازی نہیں کھیل سکیں گے۔ اس وجہ سے لوگوں کو اپنے اندر صبر کی صفت راسخ کرنی چاہیے۔

تیسری یہ کہ یہ کردار عزیمت کا کردار ہے۔ جو لوگ یہ کردار اپنے اندر پیدا کریں گے وہ ارباب عزیمت میں ہیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ان باتوں کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی ان حالات کے مقابلہ کے لیے کی گئی ہے جن سے وہ قریش کے ہاتھوں قرب ہجرت کے زمانے میں دوچار تھے اس وقت تک مسلمان نہ تو ایک منظّم سیاسی طاقت بنے تھے اور نہ ابھی قریش پر دین کی حجّت ہی پوری طرح تمام ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد جب مسلمان ایک منظّم طاقت بن گئے اور قریش پر حجّت تمام ہو گئی تو مسلمانوں کو من حیث الجماعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہوئی کہ اب مسلمان ان سے کلیتہً اپنے تمام روابط منقطع کر لیں اور اس وقت تک ان سے جنگ جاری رکھیں جب تک یہ اسلام کے آگے سپر نہ ڈال دیں۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات: ۴۴-۵۰

آگے کی آیات کا تعلق اوپر آیت ۳۶ کے مضمون سے ہے۔ وہاں سلسلۂ کلام اس بات تک پہنچا تھا کہ یہ مخالفین جس زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں یہ تو چند روزہ ہے، اصلی دولتِ جاودان ان اہلِ ایمان کے لیے ہے جو اس دنیا کی چندروزہ زندگی کی جگہ آخرت کی کامرانیوں کے لیے بازی کھیل رہے ہیں۔ اس کے بعد چند آیات میں اہلِ ایمان کا کردار بیان ہوا تاکہ کلام مطابقِ حال ہو جائے اور اس وقت کے مسلمانوں پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ بشارت انہی کے لیے ہے۔ اور ان کے مخالفوں پر بھی واضح ہو جائے کہ آج جو لوگ ان کے ہاتھوں مظلوم ہیں اب ان کے لیے فتح باب کا وقت قریب ہے۔

اس کے بعد اوپر کے سلسلۂ مضمون کو از سرِ نو لے لیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تسلی دی کہ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آئے ہوئے ہیں ان کو کوئی دوسرا ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ ان لوگوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب پانی سر سے گزر جائے گا۔ پھر آخری تنبیہ کے طور پر مخالفین کو یاد دہانی کی کہ اب بھی موقع ہے اگر سنبھلنا ہے تو سنبھل جاؤ۔ یہ وقت نکل گیا تو پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی ان کے اصل سبب غرور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ جس کو جو کچھ بھی ملتا ہے خدا ہی کی عنایت سے ملتا ہے

لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو خدا ہی سے بغاوت کا ذریعہ بنالیا ہے —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۴-۵۰

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۰

اور جس کو خدا گمراہ کردے تو اس کے بعد اس کا کوئی کارساز نہیں بن سکتا اور

تم ان ظالموں کو دیکھو گے کہ جب وہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو کہیں گے، ہے کوئی راہ دنیا میں پھر واپس جانے کی! اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ دوزخ کے سامنے اس طرح لائے جائیں گے کہ وہ ذلت سے جھکے ہوئے، کن انکھیوں سے دیکھتے ہوں گے، اور اہل ایمان کہیں گے کہ حقیقی خاسر وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کو خسارے میں ڈالا! آگاہ کہ یہ ظالمین ایک دائمی عذاب میں پڑیں گے! اور وہاں ان کے اولیاء میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا جو خدا کے مقابل میں ان کی کوئی مدد کر سکے۔ اور جس کو خدا گمراہ کر دے تو پھر اس کے لیے کوئی راہ نہیں ہے! ۴۴-۴۶

اور اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہو قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آدھمکے جو ٹالا نہ جا سکے گا۔ اس دن تمھارے لیے نہ کوئی پناہ ہوگی اور نہ تم کسی چیز کو رد کر سکو گے۔ ۴۷

اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے تم کو ان پر کوئی داروغہ نہیں مقرر کیا ہے۔ تمھارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اور انسان کو جب ہم اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں تو اس پر اترانے لگتا ہے اور اگر اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو کوئی افتاد پیش آجائے تو وہ ناشکرا بن جاتا ہے۔ ۴۸

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کی ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں ملا کر ان کو بخشتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا

ہے۔ وہی علم رکھنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۹-۵۰

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ وَّلِیٍّ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَتَرَی الظّٰلِمِیۡنَ لَمَّا رَاَوُا الۡعَذَابَ یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنۡ سَبِیۡلٍ (۴۴)

پیغمبر صلعم کی تسلی کے لیے سنتِ الٰہی کا حوالہ

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے باب میں مقرر فرمائی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ ان کی ضلالت پسندی کے سبب سے گمراہی کی راہ پر ڈال دیتا ہے وہ خدا کی توفیق بخشی سے محروم ہو جاتے ہیں اور جو خدا کی توفیق و دست گیری سے محروم ہو جائیں کوئی دوسرا ان کا کارساز نہیں بن سکتا۔ اب تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن جن پر خدا کی مار ہے وہ ہدایت کی راہ اختیار کرنے والے نہیں بنیں گے۔

'وَتَرَی الظّٰلِمِیۡنَ ...... الآیۃ'۔ 'ظٰلِمِیۡنَ' سے مراد یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے گمراہی کے لیے چھوڑ دیا۔ ان کے لیے اس صفت کے استعمال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ گمراہ کیے جانے کے مستحق اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا، اس کی ہدایت کی قدر نہیں کی بلکہ آنکھیں بند کر کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفر و شرک میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ فرمایا کہ یہ محروم القسمت لوگ آج تو اپنی روش پر بہت نازاں ہیں لیکن جب خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا دنیا کی طرف پلٹنے کی کوئی راہ اب بھی باقی ہے کہ وہاں جا کر وہ کچھ نیکی کی کمائی کریں کہ اس عذاب سے چھوٹ سکیں۔

وَتَرٰىہُمۡ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا خٰشِعِیۡنَ مِنَ الذُّلِّ یَنۡظُرُوۡنَ مِنۡ طَرۡفٍ خَفِیٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ الۡخٰسِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ وَاَہۡلِیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ (۴۵)

عربیت کا ایک اسلوب

'یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا' میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ چونکہ اس سے مراد دوزخ یا نارِ جہنم ہے اس وجہ سے ضمیر علیٰ سبیل التاویل مؤنث آئی۔ اس طرح گویا لفظ 'عذاب' کے اجمال کی وضاحت ہو گئی۔ عربی زبان میں یہ اسلوب بہت معروف ہے۔

فرمایا کہ آج تو یہ لوگ اپنی کامیاب زندگی کے غرّے میں اس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن جس دن یہ اس میں داخل کرنے کے لیے لے جائے جائیں گے تو ذلت سے اپنے سر نہوڑائے ہوئے

کن انکھیوں سے اس کو دیکھ رہے ہوں گے۔ کوئی مجرم جب مقتل کی طرف لے جایا جاتا ہے تو اس کے اندر مقتل اور جلاد کی تلوار کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا لیکن وہ کن انکھیوں سے دیکھتا ہے کہ کیا پیش آنے والا ہے۔

حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے

'وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ...... الاٰیۃ' فرمایا کہ وہاں ان کی ذلت و خواری اور تباہی کو دیکھ کر اہل ایمان پکار اٹھیں گے کہ بے شک حقیقی نامراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو قیامت کے دن خسارے میں ڈالا اور ساتھ ہی اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو بھی اپنے دباؤ یا بدآموزی سے برگشتہ کر کے اس خسارے میں مبتلا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ناعاقبت اندیش لوگ تو اپنی کامیاب دنیوی زندگی کے غرّے میں ہم کو دنیا میں خسارے میں سمجھتے رہے لیکن وہ کوئی خسارہ نہیں تھا۔ حقیقی خسارہ یہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے جس میں یہ بدقسمت لوگ مبتلا ہوئے ہیں۔

'اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں حقیقی خسارہ قیامت کے دن کا خسارہ ہے۔ فرمایا کہ آگاہ ہو کر سن لو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ ایک ابدی عذاب میں گرفتار ہوں گے جو کسی طرح ٹالا نہ جا سکے گا ــــ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو دکھ ہو یا سکھ بہرحال وہ عارضی ہے لیکن آخرت کا عذاب ابدی ہے اس وجہ سے حقیقی خسارہ ان لوگوں کا خسارہ ہے جو آخرت کے خسارہ سے دوچار ہوئے۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۶)

'مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ' یہاں 'اللہ کے مقابل میں' کے مفہوم میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب یہ لوگ اللہ کے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے تو اپنے جن شرکاء اور حمایتیوں پر ان کو بڑا ناز ہے ان میں سے کوئی بھی اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام نہ آسکے گا۔

'وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ' وہی مضمون جو اوپر آیت ۴۴ میں گزر چکا ہے، الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ، پھر آگیا ہے کہ، ان کی شامتِ اعمال کے سبب سے، اللہ نے ان کو گمراہی کے لیے چھوڑ دیا اور جن کو اللہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے ان کو کہیں بھی راہ نہیں ملتی، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ (۴۷)

'مِنَ اللّٰهِ' کا تعلق میرے نزدیک 'اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ' سے ہے اور 'لَا مَرَدَّ لَهٗ'، 'يَوْمٌ' کی صفت ہے۔

دعوت بطور زجر و تنبیہ

یہ دعوت بطور زجر و تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اب بھی وقت باقی ہے کہ اپنے رب کی دعوت قبول کر کے اپنی عاقبت سنوار لو۔ ورنہ یاد رکھو کہ جب تمہارے رب کی طرف سے وہ دن آجائے گا جو اٹل ہے تو اس وقت تمہارا اس کو قبول کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہو گا۔ اس دن نہ تمہارے لیے کوئی پناہ ہو گی اور نہ اس دن تم کسی چیز کو رد کر سکو گے۔ جو کچھ تمہارا سامنے آئے گا بے چون وچرا اس کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا۔ 'نَکِیْر' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'انکار' کیا ہے لیکن اس کا صحیح مفہوم کسی ناگوار چیز کو احساسِ غیرت کے ساتھ رد یا دفع کرنا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ (۴۸)

یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اگر یہ لوگ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں تو فبہا، نہیں قبول کرتے تو تم ان کی مطلق پروا نہ کرو۔ ہم نے تم کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں مامور کیا ہے کہ تم لازماً ان کو یہ دعوت قبول ہی کرا دو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف دعوت لوگوں تک پہنچا دینے کی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون پیچھے آیت ۶ میں بھی گزر چکا ہے۔

اصل سبب اعراض کی طرف اشارہ

'وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ ...... الاٰیۃ' یہ ان لوگوں کے سبب اعراض سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ تنگ ظرف اور ناشکرے لوگ ہیں۔ اس طرح کے انسانوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب ہم ان کو اپنی رحمت و نعمت سے نوازتے ہیں تو یہ ہمارے شکر گزار ہونے کے بجائے اتراتے اور اکڑتے ہیں اور اگر ان کی کرتوتوں کی پاداش میں ان کو ذرا کوئی اُفتاد پیش آجائے تو مایوس، بے صبر اور ناشکرے بن جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ یہ کبھی صحیح راہ اختیار کریں گے۔ آج نعمت و رفاہیت حاصل ہے تو اس کا غرور ان کے لیے حجاب بن گیا ہے اور اگر ذرا ہم ان کو اس عذاب کا مزہ چکھا دیں جس کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں تو مایوس ہو جائیں گے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ (۴۹ - ۵۰)

تنگ ظرفی کا باعث صحیح عقیدے محرومی ہے

یہ اس عقیدے کا بیان ہے جس سے محروم ہونے کے باعث ان لوگوں کے اندر یہ تنگ ظرفی اور ناشکری پیدا ہوئی ہے۔ اگر یہ لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو جو کچھ چاہتا ہے بخشتا ہے

تو اس حالت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ نعمت پر اپنے رب کے شکر گزار ہوتے اور کوئی مصیبت پیش آتی تو اس پر صبر کرتے۔

'یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ' کے بعد 'یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا ۔۔۔ الآیۃ' عام کے بعد خاص کا ذکر ہے کہ یہ خدا ہی ہے جو جس کو چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہی دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے بے اولاد ہی رکھتا ہے۔ وہی علم اور قدرت رکھنے والا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اپنے علم و قدرت کے مطابق کرتا ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے بندوں کا فرض یہ ہے کہ تمام معاملات میں خدا ہی پر بھروسہ رکھیں۔ نہ کبھی مغرور ہوں، نہ کبھی مایوس اور نہ کبھی اس کے سوا کسی اور سے لو لگائیں۔

۱۰۔ آگے کا مضمون — آیات: ۵۱-۵۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور یہ خاتمہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پوری سورہ سے بحیثیت مجموعی بھی تعلق رکھتا ہے اور اوپر کے پیرے سے بھی اس کا نہایت واضح ربط ہے۔ قرآن کے اس اسلوب کی وضاحت جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں کہ سورہ جس مضمون سے شروع ہوتی ہے بالعموم اسی مضمون کے کسی پہلو کی وضاحت پر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی دیکھ لیجیے۔ اس کا آغاز 'کَذٰلِكَ یُوْحِیْٓ اِلَیْكَ وَاِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۔۔۔۔۔۔ الآیۃ' سے ہوا تھا۔ یعنی یہ قرآن اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی اس سے پہلے اللہ تعالیٰ دوسرے نبیوں اور رسولوں پر نازل فرما چکا ہے۔ پھر مقصد اور ذریعہ دونوں کی یکسانی کی وضاحت فرمائی اور خاتمہ اس مضمون پر کیا جس سے آغاز فرمایا تھا۔ چنانچہ خاتمہ میں بھی تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو تمہید میں آئے ہیں۔ فرمایا ہے: 'وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۔۔۔۔ الآیۃ' یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ پوری سورہ از اول تا آخر ایک وحدت ہے۔

اوپر کے پیرے سے اس کا تعلق یہ ہے کہ اس کا خاتمہ مخالفین کے سبب اعراض کے بیان پر ہوا ہے۔ ان کے اعراض کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ کہتے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ ان پر اپنا کلام نازل کرتا ہے تو آخر وہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا؟ ان کے اس اعتراض کا جواب ان آیات میں دیا اور آیات کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ جواب نہایت جامع و مانع اور مسکت ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۳

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (۵۱) وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵۲) صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَا إِلَى اللَّهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ (۵۳) ع

ترجمہ آیات ۵۱-۵۳

اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی اوٹ سے یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کردے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ بڑا ہی عالی مقام، بڑا ہی حکیم ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے لیکن ہم نے اس کو ایک نُور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔ اس اللہ کے راستہ کی طرف جس کا ہی وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ آگاہ! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ

رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۵۱)

آنحضرت صلعم کے مخالفین کے ایک اعتراض کا جواب

یہ جواب ہے مخالفین کے اس اعتراض یا مطالبہ کا جو قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے نقل ہوا ہے کہ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ' اگر اللہ ان سے (پیغمبرؐ سے) بات کرتا ہے، جیسا کہ یہ دعویٰ کرتے ہیں، تو آخر وہ ہم سے رُو در رُو ہو کر بات کیوں نہیں کرتا؛ آخر ان کے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ان کو تو وہ اپنے شرفِ خطاب سے نوازتا ہے اور ہم کو لائقِ التفات نہیں سمجھتا حالانکہ ہم عزت و وجاہت میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں!

اس کے جواب میں فرمایا کہ کسی انسان کا یہ درجہ و مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُو در رُو ہو کر بات کرے۔ وہ بات کرتا ہے تو وحی کے ذریعہ سے بات کرتا ہے، یا پردے کی آڑ سے بات کرتا ہے یا اپنا کوئی قاصد یعنی فرشتہ بھیج دیتا ہے جو اس کے اذن سے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، اس کے کسی بندے کی طرف، جس کو وہ اپنے خطاب و کلام کے لیے منتخب فرماتا ہے، وحی کر دیتا ہے۔

'وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ خدا سے بالمشافہ کلام میں جو چیز مانع ہے وہ در حقیقت انسان کا اپنا ضعف اور اس کی اپنی نااہلیت ہے! اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی مقام، ایسی باعظمت، اور ایسے انوار و تجلّیات کا مظہر ہے کہ کوئی بشر اس سے رُو در رُو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت قرآن میں مذکور ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تو ان کو جواب ملا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجلّی کی تاب پہاڑ بھی نہیں لا سکتے تو تم اس کا تحمل کس طرح کر سکو گے۔

'اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اگر کسی سے خطاب کرتا ہے تو تین طریقوں سے خطاب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خطاب کی مختلف شکلیں

ایک طریقہ 'وحی' کا ہے۔ 'وحی' سے مراد دل میں بات ڈال دینے کے ہیں۔ اسی کو احادیث میں 'القاء فی الروع' یا 'نفث فی الروع' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القاء فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ چیز مجرد فکر یا خیال کی شکل میں نہیں بلکہ کلام کی شکل میں نازل ہوتی ہے جس کو نبی سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے اور اس کو محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نبیوں سے اپنے کلام کا طریقہ بتایا ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے۔

اَوْ مِنْ وَّرَآءِیْ حِجَابٍ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کی اوٹ سے بات کرتا ہے۔ یعنی نبی اللہ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھتا نہیں۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام و خطاب ہے۔ تورات اور قرآن دونوں میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات کی لیکن اس کو دیکھا نہیں اور قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی نبی سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کلام نہیں کیا۔ یہ شرف صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل ہوا۔

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی رسول یعنی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے پیغمبر کے دل پر القاء کر دیتا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ	کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے وہ اس بات کو یاد
فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ	رکھے کہ جبریل نے اس قرآن کو تمھارے دل پر اللہ کے
بِاِذْنِ اللّٰہِ (۹۷)	حکم سے اتارا ہے۔

یہی بات سورۂ نحل میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔

قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ	کہہ دو اس قرآن کو روح القدس نے تیرے رب کی
رَّبِّکَ بِالْحَقِّ (النحل: ۱۰۲)	طرف سے اتارا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب کے تین طریقے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے، جو اوپر مذکور ہوئے، اس اعتبار سے ایک مخصوص نوعیت کے حامل ہیں کہ ان میں کلام بلا واسطہ نبی پر نازل ہوتا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ اور نبی کے درمیان جبریل امینؑ کا واسطہ نہیں ہوتا اور تیسرے میں جبریل امینؑ واسطہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو طریقے ——— پہلا اور تیسرا ——— معروف طریقے ہیں۔ دوسرا طریقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخصوصات میں سے ہے۔ کسی اور نبی کے متعلق، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ چیز مذکور نہیں ہے۔ اگر الاقدم فالاقدم کے اصول کو سامنے رکھیے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ پہلے طریقہ کو مرتبہ کے لحاظ سے اوّلیت حاصل ہے۔

یہاں صرف تین طریقے مذکور ہوئے ہیں اس لیے کہ جس سوال کو پیش نظر رکھ کر یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کا جواب انہی تین صورتوں کے ذکر کا مقتضی تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین طریقوں کے علاوہ دو اور طریقے بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو اپنے بعض ارادوں سے آگاہ فرماتا ہے۔

ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ بشری شکل میں متمثل ہو کر ظاہر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ

کا پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے ان واقعات میں موجود ہے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوتے ہیں۔

دوسرا طریقہ رؤیا کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہوتا ہے وہ رؤیا میں امر فرما دیتا یا مشاہدہ کرا دیتا ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم رؤیا میں ہوا۔ غزوۂ بدر سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے واقعات رؤیا میں مشاہدہ کرائے گئے۔ ایک نہایت اہم رؤیا کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام و خطاب اور ایما و اشارہ کے پانچ طریقے ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست کلام کے سوا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخصوصات میں سے ہے، ان میں سے ہر طریقہ سے مشرف ہوئے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت موسیٰ کو بھی یہ شرف صرف ایک آدھ بار ہی حاصل ہوا باقی تورات اسی طرح کی وحی ہے جس طرح کی وحی دوسرے صحیفے ہیں۔

'اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ': یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفتوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک اس کی عظمت، رفعت اور بالاتری کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری اس کی حکمت اور اس حکمت کے لوازم —— رحمت، عدل اور ہدایتِ خلق —— کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ان دونوں کو جمع کرنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اتنی بلند و بالا ہے کہ نہ اس کو کسی سے کلام کی ضرورت ہے اور نہ کوئی یہ درجہ و مرتبہ رکھتا ہے کہ اس سے ہم کلام ہو سکے لیکن اس عظمت و رفعت کے ساتھ وہ حکیم، عادل اور رحیم بھی ہے اس وجہ سے وہ خلق کی رہنمائی اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ان کو اپنے خطاب و کلام سے بھی نوازتا ہے اور اس کے لیے اس نے وہ طریقے اختیار فرمائے جو اوپر مذکور ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر جو لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ خدا ان میں سے ہر ایک سے رُو در رُو ہو کر بات کرے تو اس قسم کے لوگ نہ خدا کی عظمت سے آگاہ ہیں، نہ اپنی لے حقیقتی سے!! ایسے احمق لوگ اپنی اس رعونت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔

وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَ لَا الۡاِیۡمَانُ وَ لٰکِنۡ جَعَلۡنٰہُ نُوۡرًا نَّہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّکَ لَتَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰہِ الَّذِیۡ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۲-۵۳﴾

وحی کی تعبیر روح سے

یہ خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کہ اسی معروف طریقۂ وحی کے مطابق ہم نے تمہاری طرف بھی ایک رُوح اتاری ہے۔ 'رُوح' سے مراد وحی ہے۔ 'وحی کو 'رُوح' سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ تمہارے لیے بھی حقیقی زندگی کا ذریعہ ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کو

اپنالیں۔ تمام آسمانی صحیفوں میں اللہ کے کلام و الہام کے لیے یہ تعبیر موجود ہے اس لیے کہ بندوں کو حقیقی زندگی، جیساکہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے، روٹی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کلام و الہام سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

'مِنْ اَمْرِنَا' اس روح کی صفت کے طور پر، دفع دخل مقدر کے لیے آیا ہے۔ یعنی یہ روح اللہ تعالیٰ کے امورِ غیب میں سے ہے۔ اس کی حقیقت و ماہیت اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ رسول جانتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت و کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے نہ تو ہر شخص کو اس کی کیفیت معلوم کرنے کے درپے ہونا چاہیے اور نہ اس بنیاد پر کسی عاقل کو اس کا انکار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اندر اس قسم کی کوئی چیز محسوس نہیں کرتا۔ جو شخص دردِ جگر کی لذت سے آشنا نہیں ہے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دردِ جگر کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرآءیل: ۸۵)	اور یہ لوگ تم سے روح (وحی) کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان کو بتادو کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو تھوڑا ہی علم دیا گیا ہے۔

یہ چیز یہاں ملحوظ رہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے جب اپنی قوموں کے سامنے اس امر کا اظہار فرمایا کہ ان کے اوپر ان کے رب کی جانب سے ایک روح نازل ہوتی ہے تو نادانوں نے ان کا مذاق اڑایا کہ یہ روح کیا چیز ہے؟ آخر اس طرح کی کوئی چیز ہم اپنے اندر کیوں نہیں محسوس کرتے؟ اسی سوال کا جواب سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے اور اسی جواب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں 'رُوْحًا' کے ساتھ 'مِنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال ہو تو اس کو اشارے کلام ہی میں جواب مل جائے۔

اس 'امر' کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے جس پر ان شاء اللہ ہم سورۂ دخان کی آیات ۴-۵ کے تحت اور سورۂ قدر میں بحث کریں گے۔

'مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا'۔ یہ اس روح کا فیضان بیان ہوا ہے کہ یہ اسی کی حیات بخشی ہے کہ تم پہلے کتاب و ایمان سے ناآشنا تھے، لیکن اس وحی کے نور سے اللہ نے تمہارے سینہ کو اس طرح جگمگا دیا کہ تم اس خلق کے اندر ایک چلتے پھرتے منارۂ نور بن گئے اور اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس نور سے راہ یاب کر رہا ہے۔ 'جن کو چاہتا ہے'، یعنی جن کے اندر اس نور سے اکتساب کی صلاحیت پاتا ہے۔ اللہ ان کو اس سے بہرہ ور فرماتا ہے اس لیے کہ اللہ کا ہر چاہنا

اس کی حکمت اور اس کے عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جس طرح منصب نبوت کا اہل ہر شخص نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہی کو منتخب فرماتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں اسی طرح اس نور کے حامل بھی وہی ہوتے ہیں جن کے اندر اس کی صلاحیت ہوتی ہے۔ گویا اس میں ان لوگوں کا جواب بھی ہے جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے اندر سے نبوت اور اپنے کلام و خطاب کے لیے کیوں منتخب فرمایا، ہمارے اوپر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی ہے کہ تم جو روشنی دکھا رہے ہو اس سے ہر شخص بہرہ یاب نہیں ہو سکتا، اس سے بہرہ یاب وہی ہوں گے جو اس کے اہل ٹھہریں گے، جو اس کے اہل نہیں ہیں ان کو یہ روشنی راہ دکھانے کے بجائے خیرہ کر کے چھوڑ دے گی۔

کتاب اور ایمان میں نسبت قالب اور روح کی ہے

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کتاب اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو نسبت قالب اور روح میں ہے۔ 'کتاب' تمام تر 'ایمان' کا مظہر اور بروز ہے۔ سادہ الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کتاب درحقیقت ایمان کے مقتضیات کا بیان ہے اس وجہ سے دونوں میں جسم و جان کا رابطہ ہے۔ جہاں تک 'کتاب' کا تعلق ہے اس سے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ناآشنا تھے اس لیے کہ آپ امّی تھے لیکن ایمان سے ناآشنائی کی جو نفی کی گئی ہے یہ اس کی تفصیلات اور مقتضیات کے اعتبار سے ہے۔ یعنی آپ ایمان کے تمام لوازم و مقتضیات سے ناآشنا تھے ورنہ حضرات انبیاء علیہم السلام تو وحی سے پہلے بھی اپنی فطرتِ سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں اس وجہ سے اجمالی ایمان ان کے اندر موجود ہوتا ہے جو وحی کی روشنی سے جگمگا کر آفتاب کی طرح ایک عالم کو منور کر دیتا ہے۔ فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی میں نسبت چونکہ ذرّہ اور آفتاب کی ہے اس وجہ سے اس کے مقابل میں اس کی نفی کی گئی ہے لیکن ہے وہ اسی آفتابِ تاباں کا ایک ذرّہ اور وہی لوگ نورِ نبوت سے اکتساب بھی کرتے ہیں جو اس ذرّہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس سے محروم کر لیتے ہیں وہ نبی کے انوار سے محروم ہی رہتے ہیں۔

استاذ امامؒ یہاں ایمان سے حکمت مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان، قول، عمل اور حال تینوں کا مجموعہ ہے اور یہی حقیقت حکمت کی بھی ہے اس وجہ سے یہ جو فرمایا کہ تم کتاب اور ایمان سے ناآشنا تھے تو دوسرے الفاظ میں گویا یہ فرمایا کہ تم کتاب اور حکمت سے ناآشنا تھے۔ گویا ایمان کے لفظ سے یہاں حکمت کی تفسیر فرما دی گئی۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ..... الآیۃ۔ یہ اس نور کی برکت خلق کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نور سے تم کو جو فیض یاب کیا تو تم جو ایک امّی تھے اب

لوگوں کی رہنمائی اس اللہ کی سیدھی راہ کی طرف کر رہے ہو جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ لوگوں کو اگر عاقبت کی فلاح مطلوب ہے تو چاہیے کہ تمہاری رہنمائی کی قدر کریں۔

'اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ'۔ یہ آخر میں لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جس خدا کا سب کچھ ہے اسی کی طرف سارے معاملات لوٹیں گے بھی۔ اس وجہ سے اس کے آگے پیشی اور جواب دہی کے لیے تیار رہو۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

رحمان آباد
۱۲ - دسمبر ۱۹۷۵ء
۸ - ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ